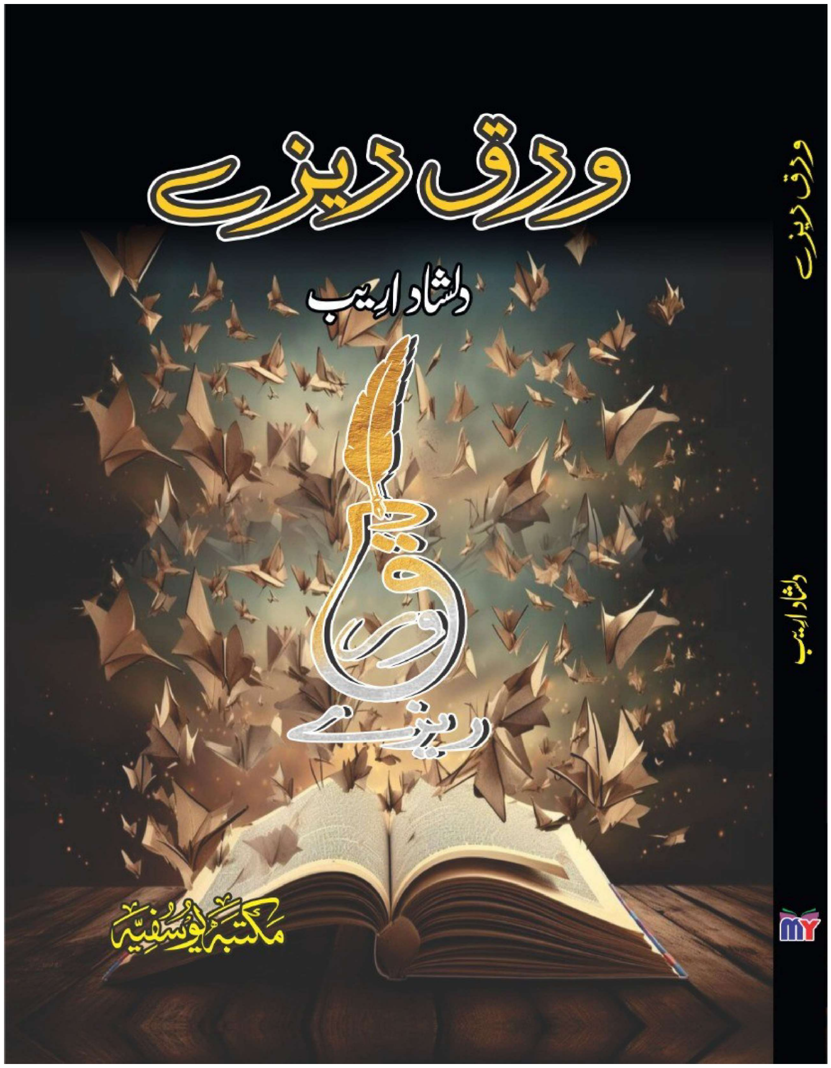
ورق ریزے
دلشاد اریب
ورق ریزے
مکتبہ یوسفیہ
ورق ریزے
دلشاد اریب

ورق ریزے

دلشاد اریب

طلوع پبلی کیشنز باغ آزاد کشمیر

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

ISBN 978-969-7861-01-9

کتاب کا نام	ورق ریزے
نام مصنف	دلشاد اریب
مطبع	ایوب پرنٹنگ پریس لاہور
تعداد	500
اشاعت اول	مئی 2025ء
قیمت	700 روپے
ملنے کا پتہ	احمد بک کارنر، حیدری چوک باغ آزاد کشمیر
	03335736140

طلوع پبلی کیشنز باغ آزاد کشمیر

مکتبہ یوسفیہ

ایوب پرنٹنگ پریس نزد گورنمنٹ آئی ہسپتال داتا دربار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

والدین کی ان محبتوں کے نام جو مجھے ہر پل جوان وتوانا رکھتی ہیں اور جن کی دعاؤں کی ردا ہر آن مجھ پر سایہ فگن رہتی ہے۔

اُن ننھی معصوم کلیوں کے نام جو اگر میرے آنگن میں نہ کھلتیں تو میں لفظ محبت کا کبھی صحیح ادراک ہی نہ کرسکتا۔

ان دوستوں کے نام جنہوں نے زندگی کے تپتے صحرا میں اپنی محبتوں کی رِدا تان کر گھٹن اور جلن کا احساس نہیں ہونے دیا۔

فہرست عنوانات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۔	کچھ اس کتاب کے بارے میں	8
۲۔	حرفِ آغاز	11
۳۔	رفتار شکن	13
۴۔	ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی	16
۵۔	اُلو ہمارے ساتھ ہیں	20
۶۔	عورت کبھی بدصورت نہیں ہوتی	23
۷۔	لنڈا اسٹیٹ	26
۸۔	جدید مردہ بدست زندہ	31
۹۔	سردیاں گرمیوں میں کیوں نہیں آتی	39
۱۰۔	کتے اور بہت کُتے	44
۱۱۔	دوسری شادی	49
۱۲۔	بلی شیر کی خالہ ہے	54
۱۳۔	مرے کہنے میں پٹواری نہیں ہے	58
۱۴۔	عمر رسیدگی (AGING)	62
۱۵۔	بجوکا	67

۱۶۔	خوش فہمیاں	72
۱۷۔	ذلیل صاحب	75
۱۸۔	ماں کی دعا جنت کی ہوا	79
۱۹۔	صاف اور صحت مند معاشرہ	82
۲۰۔	ہائے یہ سوشل میڈیا	85
۲۱۔	جوڑوں کا درد	88
۲۲۔	شحن یا جگالی	91
۲۳۔	ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ	95
۲۴۔	ہم اور ہمارے رویے	98
۲۵۔	Be Cruel to be Kind	101
۲۶۔	بھاگ ورنہ آدمی کی موت مارا جائے گا	105
۲۷۔	رہے نام اللہ کا	110
۲۸۔	فنافی زوج	115
۲۹۔	ذاتیں بھی تو پہلی سی ذاتیں نہیں رہی	119
۳۰۔	لوگ کیا کہیں گے	122
۳۱۔	قربانی	125
۳۲۔	انوکھے لاڈلے	127

کچھ اس کتاب کے بارے میں

تحقیق، تخلیق، تاریخ اور اب طنزیات و مضحکات کی صورت میں ''ورق ریزے'' اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بھی رائے اس کو پڑھنے کے بعد ہی آپ قائم کر سکیں گے۔ اس کتاب میں چھوٹی چھوٹی وہ باتیں اور وہ تلخ سچائیاں ہیں جنہیں ہم روزانہ اپنے آس پاس دیکھتے تو ہیں مگر ان پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے، ان کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتے۔ ان ساری باتوں کو غیر محسوس انداز میں ورق ریزے کی صورت میں آپ کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ آپ ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ ایک ہی چیز ایک ہی بات کو ہم کئی زاویوں سے دیکھ سکتے ہیں، پرکھ سکتے ہیں اور اس کے بارے میں بات کر سکتے ہیں۔ ان تحریروں کا تھری ڈی آپ کے سامنے ہے عام انداز سے تھوڑا سا ہٹ کر جو کہیں تو آپ کے چہرے پر ہلکی سی شگفتگی لائے گا تو کہیں حلق میں طنز کی کڑواہٹ سا۔ ایک تخلیق کار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ عام سی کسی چیز یا بات جسے عام آدمی گزرتے ہوئے صرف نظر کر کے گزر جاتا ہے وہ اسے خاص بنا لیتا ہے۔ ایسے ہی اس کتاب کی عام سی تحریروں کو آپ کے لیے خاص بنایا گیا ہے۔

زندگی دائروں کا سفر ہے، ہر گام پر آپ کو کہیں کچھ نیا محسوس ہوتا ہے تو کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ اس موڑ سے ہم پہلے بھی کہیں گزرے ہیں۔ جس طرح ہم دائرہ در دائرہ مسلسل سفر میں ہیں اسی طرح اُردو ادب کی سات سو سال سے زائد کی تاریخ پر نگاہ دوڑائیں تو یہ بھی آپ کو دائروں کا سفر لگے گا۔ ایک ہی طرح کے موضوعات پر مختلف ادوار میں مختلف ادباء نے قلم فرسائی کی اور ان موضوعات کو اپنے خاص اندازِ بیان سے عام سے خاص بنا کر رکھ دیا۔ بقول سیف الدین سیف

سیف اندازِ بیاں رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

اس کتاب میں پیش کیے گئے عنوانات اگرچہ آپ کو روایتی لگیں گے مگر اسلوب تحریر سے آپ ان کے جداگانہ پن کا اندازہ کر سکیں گے۔ پہلے پہل خیال یہ تھا کہ اس کتاب کے مندرجات کو ترتیب دیتے ہوئے اس کی صنف ادب کے بارے میں بھی خود سے ہی کوئی حتمی فیصلہ بھی صادر کر دیا جائے کہ ان تحریروں کا تعلق ادب کی فلاں صنف سے ہے مگر یہ سوچ کر اس کو آپ قارئین پر چھوڑ دیا ہے کہ اگر یہ سب بھی میں نے کرنا ہے تو پھر بھلا آپ کیا کریں گے۔ ان تحریروں کا تعلق نثر کی اس صنف سے ہے جو بظاہر مضمون لگتی ہیں مگر ان کا انداز جداگانہ ہے اور تحریروں کو بغیر نتیجہ قائم کیے آپ قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔ ان تحریروں کی یہی دلچسپ بیانی، منطق واستدلال، خوشگوار استعجاب، تیکھا نظریہ اور غیر رسمی انداز اسے دوسری اصناف نثر سے مختلف بنا رہا ہے۔ اسی لیے ان تحریروں میں معلومات کی بجائے تاثرات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر جانسن:

It is a 'loose' of mind یعنی یہ انسانی دماغ کی ڈھیلی اور بے پرواہ قسم کی اُڑان ہے۔

اس کتاب کے مندرجات کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکیں گے۔ اس میں انشائیہ کے لوازمات بھی آپ کو قدم قدم پر دکھائی دیں گے اور ہلکے پھلکے طنز ومزاح کا تڑکا بھی آپ کے ذوق سلیم اور تفنن طبع کے لیے نظر آئے گا۔ یہ تحریریں اس لیے بھی اس انداز میں ترتیب دی گئی ہیں کیونکہ بقول یوسفی: ''مزاح نگار اس لحاظ سے بھی فائدے میں رہتا ہے کہ اس کی فاش سے فاش غلطی کے بارے میں بھی پڑھنے والے کو یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ ممکن ہے اس میں بھی تفنن کا کوئی لطیف پہلو پوشیدہ ہو جو غالباً موسم کی خرابی کی وجہ سے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے تو زندگی گزارنے کے لیے انسان کو جو بنیادی عناصر درکار ہیں ان میں عبادت وریاضت بھی ضروری ہے اور طنز وظرافت بھی جس سے باطن ہر لحظہ پر مسرت اور روشن وسرشار رہتا ہے اور ظاہر پر بھی نکھار قائم ودائم رہتا ہے۔ کتاب سے دوری اور بیگانگی کے ان حالات میں اس کتاب کا انداز تحریر آپ کو ضرور کتاب سے کچھ وقت کے لیے ہی سہی قریب تر کرے گا۔ اس کتاب میں آپ کو جو مضامین

پڑھنے کوملیں گےان کے بقول پطرس:''تمام کردار خیالی ہیں اور کسی بھی قسم کی مماثلت محض اتفاقیہ ہوگی''لہذا کسی بھی بات کو ہرگز دل پر نہ لیا جائے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ موجودہ دور کی ناخالص خوراک،مصنوعی ماحول اور دل کے کثرتِ استعمال کے سبب اسے اتنا جرنیلی سڑک بنا دیا گیا ہے جو کسی بھی لمحے حد رفتار تجاوز کرنے کے باعث دھڑکنا بھول سکتا ہے۔

ان تحریروں میں موجود وہ سب کچھ جو آپ کے من کو بھایا ہے وہ آپ کے ذوق سلیم کا کمال ہے۔یہ تحریریں ذہن کی وہ اختراعات ہیں جو وقفے وقفے سے سرزد ہوتی رہیں اور جنھیں بلاکم وکاست ترتیب دے کر آپ کی بزم میں رکھ دیا ہے۔اب فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ ان کا شمار ادب کی کس صنف میں معتبر ہوسکتا ہے۔ کتاب کی تدوین اور تکمیل میں پروفیسر شفیق راجا،سید شہباز گردیزی، بشارت تنشیط اور دیگر جن احباب کی محبتیں شامل حال رہیں ان سب کی بلندی اقبال کے لیے ہمیشہ دعا گو ہوں۔امید کامل ہے کہ آپ اپنی مثبت آرا سے نوازتے رہیں گے۔

دلشاد اریب

03335736140

Email: areeb929@gmail.com

15 مئی2025ء

حرف آغاز

ہزاروں سال سے'' دنیا کی سب سے بڑی دولت'' کے بارے میں خطہ ارضی کے مختلف خطوں میں رہنے والے مختلف زبانوں یا بولیوں میں اپنی دانش کا اظہار کرنے والے دانشوروں کے بے شمار اقوال گردش کر رہے ہیں۔کوئی سکون کو سب سے بڑی دولت قرار دیتا ہے، کوئی سخت بھوک میں روٹی کے ایک نوالے کو، کوئی شدید پیاس میں پانی کی ایک اوک کو، کوئی غلامی کی گھٹن میں آزادی کی ایک سانس کو، کوئی کسی چیز کو، کوئی کسی عمل کو، کوئی کسی رویے کو۔غرض ہم آج تک یہ معلوم نہیں کر سکے کہ ان میں سے کون سا قول صحیح تر ہے۔

ہزاروں سال سے سائنس اپنا پٹارہ کھول کے بیٹھی ہے عمرو عیار کی اس زنبیل میں ہر طرح کی ایجادات و آلات کا ایک بھنڈر ہے، سوئی سے لے کر بحری جہاز تک، ایک چھرے سے لے کر ایٹم بم تک، سوچنا یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا سائنس دان کون ہے اور'' سب سے بڑی ایجاد'' کیا ہے؟ یہ کوئی دوائی، کوئی انسان کی مدد کرنے والا روبوٹ ہے یا کچھ اور تو اس بارے میں بھی مختلف روایات اور نظریے ہیں تاہم اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی ایجاد'' پہیہ'' ہے اور سب سے بڑا سائنسدان وہ شخص تھا جس نے پہیہ ایجاد کیا۔

کیا خیال ہے کہ یہ ساری آسائشیں، یہ ساری ایجادات، سکون کے یہ سارے عوامل کے بیچ میں اگر لفظ نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اشارہ یا لفظ میں صرف زمانی بُعد ہے، ورنہ اشارہ لفظ کی کوکھ ہی تو ہے۔ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ دنیا میں سکون کا سب سے بڑا لمحہ ماں کے لیے اس کے بچے کی پہلی کلکاری، اس کی زبان سے نکلنے والا پہلا لفظ، پہلی بامعنی صدا ہے گویا ہر عمل کے لیے، اس کے اظہار کے لیے لفظ اکیلا ذریعہ ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی پہلی اور سب سے بڑی ایجاد'' لفظ'' ہے اور انسان کی سب سے بڑی دولت بھی............

لفظ قدم قدم پر انسان اور اس کی ہر دانش کے اظہار کا واحد Tool ہے۔ پکار سے، نعرے تک، نعرے سے احتجاج تک، کلمے سے الہامی کتاب تک سب کچھ لفظ ہی لفظ۔عمل اظہار کے بعد کی چیز ہے اور کچھ

نہیں۔سائنس کی ہر ایجاد کے لیے،اس کے فارمولے کوتحریر کرنے کے لیے، جذبے کے اظہار کے لیے''لفظ'' بنیادی آلہ ہےاور ذریعہ ہے۔

یہ دنیااور یہ کائنات اوراس کے متعلقات پتہ نہیں کتنے ہزار یا کتنے لاکھ سال سے قائم ہیں اوران میں بسنے والی مخلوق بھی اتنے ہی عرصہ سے اس کے اندر رہ رہی ہوگی۔سوچیۓ اگراس مخلوق کے مابین رابطے کا کوئی لسانی یااشاراتی ذریعہ نہ ہوتا تو............؟ ہماری سائنس، ہمارے اخلاق وعمل کے فلسفوں کا کیا ہوتا؟ یہ ایک دل یا دماغ سے دوسرے دلوں، دماغوں یااجزائےعمل تک کیسے پہنچتے ؟ تو یہ طے ہے کہ اس وقت تک انسان کے لیےسب سے بڑی دولت،سب سے بڑی ضرورت،سب سے بڑی آسائش''لفظ'' ہے۔

اب لفظ کو بنانے،اسے سنوارنے،اسے بہتر استعمال کا نام''ادب'' ہے۔یہی ہمارا آج کا موضوع ہے۔ادبی دنیامیں لفظ کی ہیئتوں کےمختلف مظاہر ہیں ان میں جدیدترین مظہر''انشائیہ'' ہےاور یہ اس اعتبار سے بھی اہم تر ہے کہ آج کی دنیا میں عدیم الفرصتی ایک بڑا مسئلہ ہے ہر کوئی شکایت کرتا ہے کہ اس کے پاس مطالعے کا وقت نہیں وغیرہ وغیرہ............۔

اس ساری تمہید کا مقصد آپ کے اور ہمارے بہترین ادیب،نثار، شاعر''دلشاد اریب'' کے انشائیوں کا مجموعہ''ورق ریزے'' ہے جواس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ان تحریروں میں آپ کووہ سب کچھ ملے گا جوآپ اس کتاب سےتوقع کررہے ہیں۔ ہمارے آس پاس پھیلے ہوئے بیسیوں ایسے موضوعات جنھیں ہم دیکھ کرصرف نظر کر جاتے ہیں دلشاد اریب نے ان کواس کتاب کا موضوع بنایا ہےاورانہیں پراثر انداز میں ترتیب دے کر ورق ریزے کی صورت میں آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے یہ مجموعہ ہاتھ میں لے کراس کے اوراق پرنظر جمالی تو یہ کتاب آپ کونظر ہٹانے نہیں دے گی۔ ہمارے کلاسیکی اور جدیدنثری ادب کے بین بین اس کے اچھوتے عنوانات آپ کے ذوق سلیم کی تشفی کریں گےاور آپ ان تحریروں کا حظ اُٹھائیں گے۔بسم اللہ کیجیے آپ کومیری باتوں کا یقین آجائے گا۔

پروفیسرشفیق راجہ

رفتار شکن

وہ مصنوعی روک یا ابھار جو عموماً شاہرات پر گاڑیوں کی رفتار کو کنٹرول کرنے کے لئے متعلقہ محکمہ کی طرف سے تعمیر کئے جاتے ہیں۔مگر ہمارے ہاں اس کے لیے بے چارے مظلوم محکمہ شاہرات کو تکلیف کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔سڑک کے آس پاس بسنے والے خود ہی جب چاہیں یہ مقدس فریضہ سرانجام دے لیتے ہیں۔اگر دیکھا جائے تو اپنی ضرورت کے لئے لگائے جانے والے یہ رفتار شکن(Speed breaker) ،اچھال اور جمپ سپیڈ بریکر کم اور Vehicle breaker زیادہ ہوتے ہیں۔اس لئے عموماً ان وہیکل بریکروں پر سے گزرنے والی گاڑی اپنا کچھ نہ کچھ گنوا کر ہی گزرتی ہے۔

ایک شہر سے دوسرے شہر تک کا جو سفر زمانہ ماضی میں شاہرات کی ناپختگی اور تنگی کے باعث کئی کئی گھنٹوں اور دنوں میں طے ہوتا تھا وہ آج بھی بین الاقوامی معیار کی کشادہ پختہ سڑکیں بننے کے باوجود ان وہیکل بریکروں کے باعث اتنے ہی وقت میں طے ہوتا ہے۔عسکری کیمپوں کے پاس اس طرح کے درجنوں سپیڈ بریکرز تو جہاد فی سبیل اللہ کی عملی تفسیر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ستم بالائے ستم وہاں سے گزرتے ہوئے جلّی الفاظ میں لکھے ہوئے جملے "دور رہیں ورنہ گولی ماردی جائے گی"انسان کے جذبہ حب الوطنی کو اوج ثریا پر پہنچا کر رکھ دیتے ہیں جس کی ایک جھلک وطن عزیز میں " گوادر کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر" ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔

کسی علاقے کے مکینوں کی وسعت قلبی اور کشادہ نظری دیکھنا ہو تو ان کے آس پاس سے گزرنے والی راہ گزر اور شاہراوں سے بخوبی ان کے ذوق سلیم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔بحیثیت قوم ہماری خوبی یہ ہے کہ ہم ہر وہ کام کرتے ہیں جو کرنے کا نہیں ہوتا اور ہر اس کام سے جی چراتے ہیں جو ہمیں لازماً کرنا چاہیے۔چنانچہ لوٹ کھسوٹ ہو یا بدعنوانی،کام چوری ہو یا بددیانتی،سڑکوں پر کوڑا کرکٹ پھینکنا اور گندگی پھیلانا ہو یا سپیڈ بریکرز کی تعمیر ہم دنیا بھر کی مہذب اقوام سے کہیں آگے ہیں اور ہر ممکن طریقے سے اس کار خیر میں اپنا

حصہ ڈالتے نظر آتے ہیں۔ جو بے چارے سپیڈ بریکرز کی تنصیب وتعمیر میں دوسروں سے آگے نہیں بڑھ پاتے اور پیچھے رہ جاتے ہیں وہ مستقل طور پر ہماری زندگیوں میں سپیڈ بریکر کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

انسانی زندگی حادثات سے عبارت ہے۔ سڑکوں پر سفر کرتے ہوئے یہ امکان اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ حادثات کے عوامل میں چاہے ڈرائیور کی غفلت ہو چاہے کوئی تکنیکی خامی اور چاہے کسی دوسرے ڈرائیور کی شعوری یا غیر شعوری غلطی۔ عموماً اس طرح کے حادثات بعض اوقات جان لیوا ہو جاتے ہیں اور کئی کئی گھرانوں کو اس کا ناقابل تلافی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہاں حادثات کے حوالے سے بھی ہمارا رویہ یہ ہے کہ ادھر سڑک پر کوئی حادثہ رونما ہوا ادھر متاثرہ خاندان کے ورثاء نے سپیڈ بریکر تعمیر کر کے اپنے مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے مستقل صدقہ جاریہ کا بندوبست کر لیا۔

ایک دور تھا جب ایصال ثواب کے لئے جن صدقہ ہائے جاریہ کا اہتمام کیا جاتا تھا وہ انسانیت کی فلاح اور آسانیاں تقسیم کرنے کے لئے ہوا کرتے تھے۔ اس کام کے لیے کبھی تو فاتحہ خوانی اور لنگر کا اہتمام کیا جاتا تو کبھی صدقہ جاریہ کی صورت میں کوئی کارخیر کر لیا جاتا۔ اب اس کا آسان طریقہ عوام الناس نے ڈھونڈ نکالا ہے۔ کہیں تو کتوں، بیلوں اور مینڈھوں کو لڑا کر تو کہیں کوئی میموریل ٹورنامنٹ کروا کر مرحومین کو ایصال ثواب کیا جاتا ہے۔ جو بیچارہ اس سارے کارِخیر سے بچ جائے وہ اپنے گھر یا دکان سے باہر سڑک پر سپیڈ بریکر کی تعمیر کر کے یہ فریضہ سرانجام دے لیتا ہے بلکہ جس کو جتنا زیادہ ایصال ثواب درکار ہوتا ہے وہ اتنا ہی اونچا سپیڈ بریکر تعمیر کر کے یہ کارثواب سمیٹ لیتا ہے۔ گاڑی پر گزرنے والا خود ہی اس وہیکل بریکر سے گزرتے ہوئے اس کی تنصیب کرنے والے کی سات پشتوں کو ایصال ثواب کر کے گزرے گا۔

اگر ہم دیکھیں تو معاشرے میں رہتے ہوئے ہماری زندگیاں دوسروں کے لیے انہی سپیڈ بریکرز کی مانند ہوتی جا رہی ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کی دانستہ اور غیر دانستہ طور پر یہ خواہش رہتی ہے کہ ہم دوسروں کے لیے وہ سپیڈ بریکر بن کر رہیں جن کی موجودگی میں اس کی زندگی کی گاڑی جب ہمارے قریب سے گزرے تو رک کر اور ہماری شکرگزار اور اطاعت گزار بن کر گزرے۔ خدانخواستہ کوئی اس اطاعت سے انحراف کر کے تو دیکھے ہم شاید اس کا جینا محال کر کے رکھ دیں۔ یہ ایک رویہ ہے جو بحیثیت مجموعی معاشرے میں کسی نہ کسی

صورت رائج ہے۔ خال خال ہی اس معاشرے میں کچھ لوگ ہوں گے جو دوسروں کے لیے کارِ خیر کا باعث ہیں، جو دوسروں کی زندگیوں میں راحتیں اور آسانیاں تقسیم کرتے ہیں۔ جو دوسروں کے سکون کے لیے اپنے سکون کو داؤ پر لگا دیتے ہیں حتیٰ کہ دوسرے کی آسانی کے لیے اپنی راحت اور آسانی کو قربان کر دیتے ہیں۔

معاشرے ایسے ہی تشکیل نہیں پاتے ،فلاحی اور اچھے معاشرے کی تشکیل تو گویا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اچھے معاشرے کی تشکیل میں افراد معاشرہ کا کردار بنیادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ معاشرے کے اچھے افراد اپنی ذات کی نفی کر کے دوسروں کی آسانیوں کی فراہمی کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں رہتی کہ اس کارِ خیر میں ان کو کیا حاصل ہوتا ہے۔تمام انبیاء و مرسلین اور مصلحین اسی قبیل کے افراد میں شمار ہوتے ہیں جو معاشرے کی فلاحی تشکیل کا عزم لیے گھروں سے نکلتے ہیں اور مخلوق کو الخلق عیال اللہ یعنی اللہ کا کنبہ سمجھتے ہوئے ان کی خدمت میں سرگرداں رہتے ہیں۔ان کی یہی کوشش ان کو معاشرے میں یکتا اور قابلِ تقلید بناتی ہے۔

اسلام کے سارے نظام عبادات اور معاشرت کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل دوٹوک اور واضح ہے کہ اسلام اگر اللہ کی رضا طلبی کے لیے عبادات کی تلقین کرتا ہے تو اس سے کہیں زیادہ مخلوق خدا کی خدمت اور ان کے لیے آسانیاں فراہم کرنے کا داعی ہے۔حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو عورتوں کا واقعہ صحابہ کے سامنے بیان کیا جن میں سے ایک بہت نیک اور پرہیز گار تھی مگر دوسروں کو ایذا دیتی تھی جبکہ دوسری صرف فرائض کا اہتمام کرتی مگر اپنے ہمسائیوں کے ساتھ حسنِ سلوک میں اچھی تھی۔ آپ نے اس عمل کی وجہ سے پہلی کے جہنمی اور دوسری کے جنتی ہونے کی بشارت سنائی۔ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ عبادت سے جنت ملتی ہے اور خدمت سے خدا ملتا ہے۔ ہم اگر جنت کے طالب ہیں تو عبادت کا راستہ ہے اور اگر خدا تک رسائی کے خواہش مند ہیں تو اس کے لیے جذبہ خدمت کو اپنا ہو گا۔ دوسروں کی زندگیوں میں سپیڈ بریکر بن کر زندگی گزارنے کی بجائے دوسروں کے لیے آسانیاں پھیلانے والا بننے میں ہی دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔

☆☆☆

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی

کہتے ہیں کہ ہم جس چہرے کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں وہ ہمارا اپنا نہیں ہوتا مگر جس چہرے کے ساتھ ہم مرتے ہیں وہ ہمارا اپنا ہوتا ہے۔ درمیان کے اس عرصہ میں ہم کتنے چہرے بدلتے ہیں اس کا ہمیں بھی ادراک نہیں ہوتا۔ ذرا تصور کریں کہ پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے اس بات پر بحث شروع ہوتی ہے کہ اس کا چہرہ کس پر گیا ہے۔ ماں کے بقول اس کا چہرہ اس کے ننھیال پر گیا ہے جبکہ بچے کی دادیاں، پھوپھیاں اس پر بحث کرتے نہیں تھکتی کہ اس کا چہرہ اس کے ددھیال پر گیا ہے، رہا بچہ تو وہ ان سب کی باتیں سن سن کر محظوظ ہوتا رہتا ہے اور کلکاریاں مار مار کر سب کو یہ یقین دلا رہا ہوتا ہے کہ آپ سب ٹھیک کہتے ہیں۔

گھر سے بات نکلتی ہے تو باہر سے آنے والے مہمان، عزیز اور رشتہ دار نومولود کی پیدائش کی مبارک باد اور سلامیاں دینے کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی قیافہ شناسی کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اس کا چہرہ کبھی ننھیال تو کبھی ددھیال سے ملاتے ہیں اور بعض حالات میں تو گاؤں محلے اور اطراف میں موجود کسی بھی مرد و زن سے ملانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یہی بچہ جب بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی کا سفر شروع کرتا ہے تو جہاں کئی چہرے بدلتا دکھائی دیتا ہے وہیں اس کے اندر کا انسان بھی کئی پینترے بدلتا ہے۔ باہر جا کر کوئی شرارت کر کے گھر آئے تو سب کہتے ہیں کہ یہ کس پر گیا ہے۔ ہر ایک کے ساتھ اس کا رویہ یکساں نہیں ہوتا، خوشی اور غم کے احساسات ایک نہیں ہوتے۔ چیزوں کو قبول اور رد کرنے کے حوالے سے اس کا ردعمل یکساں نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ زندگی کئی بہاریں دکھاتی ہے سو بہاروں کے اس سفر میں انسان بھی کئی پینترے بدلتا ہے اور جب عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اس کا چہرے بدلنے کا سفر بھی جاری و ساری رہتا ہے جو چہرہ اس نے اپنے لیے رکھا ہوتا ہے اُسے وہ ہمیشہ سب سے چھپا کر رکھتا ہے اس کے برعکس دوسروں سے ملنے کے لیے اس نے الگ الگ چہرے رکھے ہوتے ہیں۔ محفل رنداں میں اس کی شکل دیکھنے کے لائق ہوتی ہے جبکہ گھر والوں کی نظر میں اس کا معصوم سا چہرہ اس کو سب کی نظر میں بھولا بھالا قرار دلوا رہا ہوتا ہے۔ اپنے من پسند شخص

کے لیےاس کا چہرہ وہ چہرہ ہوتا ہے جواس کے من پسند کے لیےسب سے بڑھ کرمحبوب ہوتا ہے۔اس چہرے کے ساتھ وہ صرف اپنے من پسند شخص پر ہی کھلتا ہےاوراس کے دل و دماغ کا ایک ایک دریچہ صرف اسی پر وا ہوتا ہے۔کاروباری چہرہ اور ہوتا ہے، ملازمت اور روزگار والا چہرہ اور ہوتا ہے۔دوستوں کے لیے یہی آدمی اور ہوتا ہے جبکہ دشمنوں کے لیےاس سے ہٹ کرایک اورآدمی............صبح کے وقت ہم ایک اور شخص سے مل رہتے ہوتے ہیں جبکہ شام کے وقت ملنے والا یہی آدمی ایک اورآدمی کے بہروپ میں مل رہا ہوتا ہے۔

شادی کر کے ہم جس شخص کوگھر لاتے ہیں وہ اورآدمی ہوتا ہےاورشادی کے چند دن بعد پتہ چلتا ہے کہ ہم جن اوصاف کے حامل شخص کولائے تھے یہ وہ شخص ہے ہی نہیں۔شادی سے پہلے محبوب کے روپ میں ملنے والاشخص وہ تھا جومحبوب کی ایک ایک ادا پر جان وارتا تھااورآسمان سے تارے توڑ کرلانے کی باتیں کرتا تھا۔محبوب کی ذراسی تکلیف پرتڑپنے اور جان نچھاور کرنے والا شادی کے بعداسی محبوب کے سامنے اتنا بےحس کہ کوئی اس کے سامنے تڑپ کر جان دے رہا ہوتا ہےاوراسے احساس تک نہیں ہوتا۔شادی کے چند سال بعد ایک ساتھ رہنے والے دوافراداب آپس میں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو چکے ہوتے ہیں۔ایک کا رخ مشرق کی طرف ہےتو دوسرے کا مغرب کی طرف............ماں باپ کے روپ میں اپنی ذاتی شناخت چھپا کرایک نئی شکل میں اپنی اولاد کے سامنے ہوتا ہے۔سخت ترین مشقتوں اورسنگین حالات میں اسے اپنے اردگرد کا کوئی ہوش نہیں ہوتا اوراس کے شب وروز اولاد کی راحت اورضروریات کی تکمیل کے لیے کچھ اس طرح سے گزرتے ہیں کہ اب اسے یہ ہوش ہی نہیں ہوتا کہ اس کا اپنا بھی کوئی چہرہ تھا۔وقت کی تیز دھوپ اس کے چہرے کے سب نقوش اُڑادیتی ہے بقول ندافاضلی

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

اس میں کوئی مبالغہ نہیں،کوئی دورائےنہیں کہ یہاں ہر آدمی میں دس بیس آدمی بیک وقت محوسفر رہتے ہیں۔ایک ہی آدمی ہرایک کے لیے الگ الگ ہوتا ہے۔ایک کا اگر وہ حبیب ہےتو دوسرے کا رقیب، ایک کا اگر وہ محبوب ہےتو دوسرے کا مبغوض،ایک کے لیے وہ راحتِ جاں ہےتو دوسرے کے لیے دشمنِ جاں

......ارتقاء کا یہ سفر یوں ہی آخری سانس تک جاری وساری رہتا ہے۔عمر بھر لوگوں کو دکھانے کے لیے ہم وہ چہرہ تراشتے رہتے ہیں۔یوسفی صاحب نے ایسے ہی کسی چہرے کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہر گھر کا ایک چہرہ ہوتا ہے جس سے اُس گھر کی پہچان ہوتی ہے۔بلکل ایسے ہی ہر قوم، ہر معاشرے کا بھی ایک چہرہ ہوتا ہے جو اس قوم و اُس معاشرے کی پہچان کرواتا ہے۔بلاشبہ ہم جس چہرے کو لے کر پیدا ہوتے ہیں وہ ہمارا اپنا نہیں ہوتا مگر ہم جس چہرے کے ساتھ مرتے ہیں اور عمر بھر تراشتے رہتے ہیں یہی ہمارا اپنا چہرہ ہوتا ہے۔

رہی سہی کسر یہ Salons (حسن کاری کی دکانیں) اور Beauty parlors (آرائش گھروں) والی ہستیوں نے کچھ اس طرح سے پوری کی ہے کہ جو آدمی ان پارلرز کے دروازوں سے اندر جاتا ہے وہ اور ہوتا ہے اور جو وہاں سے تیار ہو کر نکلتا ہے وہ کوئی اور............کل تک ان سیلونز اور پارلرز کو چلانے والے مخصوص خاندانوں کے لوگ ہوا کرتے تھے۔جب معاشرے میں آرائش بدن کی دوڑ شروع ہوئی تو ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز کیا ادنیٰ کیا اعلیٰ ہر گھرانے کے مرد و زن اپنے اپنے گھر کے بیرونی کمرے کے باہر ایک بڑا سا پارلر کا بورڈ آویزاں کر کے خاندانی ہو گئے۔یوں اس حمام میں اب محمود و ایاز سب ننگے ہیں، کسی کو کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ یہ اسی بہار کا نتیجہ ہے کہ کل کی نانیاں نئے چہرے کے ساتھ آج کی نوخیز کلیاں بن کر داد نظارہ دیتی پھر رہی ہیں اور کل کے بابے نئے چہرے کے ساتھ آج کے وجیہہ جوان قرار پا کر تابِ نظارہ لا رہے ہیں۔رہی سہی کسر نیم حکیم پوری کر کے ان نئے آدمیوں میں ''عملیت'' کے رنگ بھر رہے ہیں۔

گزشتہ دنوں کسی افریقی ملک کی خاتون کا چرچا عام تھا جس نے صرف 35 سال کی عمر تک 55 شادیاں کر کے گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام لکھوایا ہے۔ذرا سوچیں کتنا مشکل ہوتا ہوگا ہر نئے آدمی کے لیے نیا آدمی بن کر پیش آنا............۔معاشرے پر نظر ڈالیں تو آج کل حقیقی محبت کی بجائے ظاہری خدوخال پر مر مٹنے کا رجحان عام ہے۔اب مرد و زن دونوں بیک وقت کئی کئی لوگوں کے ساتھ Flirt (عارضی محبت) میں مبتلا ہیں۔یوں ایک ہی آدمی بیک وقت کئی کئی آدمیوں کا بہروپ بھر کر کبھی ایک اور کبھی دوسرے اور کبھی تیسرے کے ساتھ عہد وفا کی قسمیں نبھاتا پھرتا ہے اور جو ایسا نہیں کرتا وہ اس معاشرے کی روایات کے مطابق نرا بدھو ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس

آدمی جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا......

شنید ہے کہ دنیا بھر میں ان بدلتے چہروں اور ایک ایک آدمی میں بے شمار آدمیوں کی موجودگی کے اثرات سے بچنے کے لیے ٹیکنالوجی کی جدت کو اپناتے ہوئے روبوٹس کی تیاری پر تیزی سے کام جاری ہے جو بہت جلد انسان کی جگہ لے لیں گے اور دفتروں سے ہسپتالوں تک اور کاروباری مراکز سے ہوٹلوں اور ائیر پورٹس تک وہ سارے افعال سرانجام دیں گے جو کبھی انسان سرانجام دیا کرتے تھے۔خانگی زندگی کو انسان کے ان بہروپوں کے اثرات سے بچانے کے لیے Silicon dolls سلیکون کی دلہنیں اور دلہے نہایت مناسب نرخوں پر دستیاب ہوں گے جو زن وشوہر کی جگہ لے لیں گے۔ یوں خانگی زندگی میں بھی جوڑوں کی ہر روز کی ایک دوسرے پر چیخ چیخ کے عذاب سے نجات میسر ہوگی۔ان حالات میں رہا مسئلہ افزائش نسل کا تو اس کے لیے پہلے سے ہی دنیا بھر کی مارکیٹوں میں کرائے کی کوکھیں Surrogate mothers دستیاب ہیں جو ایک معقول معاوضے پر آپ کو بچہ پیدا کر کے دے دیں گی۔اس طرح بادی النظر میں دنیا امن کا گہوارہ بن جائے گی۔

☆☆☆

اُلو ہمارے ساتھ ہیں

اُلو کے اُلو ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ اُلو ہے۔ جہاں تک اس کی نوع کا تعلق ہے تو یہ ایک شکاری پرندہ ہے جس کا سر اور چہرہ انسانی دل کی مانند گول ہوتا ہے جیسا دل ہم عموماً محبوب یا محبوبہ کے لیے کاغذ پر بناتے ہیں۔ رہی بات تھری ڈی کی تو جس تھری ڈی کی آج دنیا بھر میں دھوم ہے کہا جاتا ہے کہ اُلو اس تھری ڈی کی عملی شکل ہے اور تین اطراف میں دیکھ سکتا ہے جبکہ اُلو کہلائے جانے والا انسان محض دو اطراف میں ہی دیکھ سکتا ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ اُلو رات کا فلسفی ہے اور صرف رات کو ہی دیکھ سکتا ہے یہ درست نہیں البتہ اس کے شکار کے اوقات اکثر صبح یا شام ہوتے ہیں۔ یہ اپنی ذات میں ایسی پراسراریت رکھتا ہے کہ جس کی آواز سے اچھے اچھوں کی نیند تک اُڑ جاتی ہے۔

افریقہ میں اسے بیماری اور بدبختی کی علامت کے طور پر لیا جاتا ہے جبکہ ہندوؤں کے ہاں اسے لکشمی دیوی کی سواری سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ خیال راسخ ہے کہ اگر یہ عقلمند ہوتا تو اُلو کیوں ہوتا۔ اسے لیے اسے منحوس خیال کیا جاتا ہے اور اس بیچارے کی ہر وقت شامت آئی رہتی ہے۔ ذرا سا کسی نے کام میں ادھر اُدھر کیا یا گڑبڑ کی تو ایک دم اسے اُلو کا پٹھا قرار دے دیا گیا۔ جو کوئی کسی کی سادہ لوحی کا فائدہ اُٹھانے میں کامیاب ہو گیا گویا اس نے اسے اُلو بنا دیا۔ گویا اُلو بیوقوفی کا وہ استعارہ ہے جسے جس نے جہاں چاہا استعمال کر لیا۔ اس کی بھی شامت اعمال دیکھیں کہ اگر چڑیاں کسی درخت پر اسے بیٹھا ہوا دیکھ لیں تو آسمان سر پر اُٹھا لیتی ہیں۔ کوئی ان سے ذرا پوچھے ان کو کیا ہو گیا ہے، اُلو ہی ہے جو اپنی مرضی سے کسی ٹہنی پر بیٹھا ہے کچھ دیر میں اُڑ جائے گا۔ مگر مجال ہے جو وہ ٹس سے مس ہوں اپنی یہ تکرار اس وقت تک جاری رکھتی ہیں جب تک اُلو اس ٹہنی سے اُڑ کر اپنا ٹھکانہ بدل نہیں لیتا۔

ہمارے ہاں اُلو کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں ایک وہ ٹہنی پر بیٹھا قدرت کی فیاضیوں سے لطف اندوز ہوتا اور شکار پر گزارا کرتا ہے جبکہ دوسرا جو ہمارے آس پاس ہر دوسرے قدم پر دکھائی دیتا ہے۔ اُس میں اور اس

میں بس اتنا سا فرق ہے کہ جو شاخ پر بیٹھا ہوتا ہے وہ اُلو ہے اور جو ہمارے آس پاس پایا جاتا ہے وہ اُلو کا پٹھا کہلاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہمارا محبوب کام دوسروں کو اُلو بنانا اور محبوب تکیہ کلام اُلو کا پٹھا ہے۔

جہاں تک پٹھے کی بات ہے تو ایک پٹھا وہ ہوتا ہے جو ہمارا اعضلاتی پٹھا کہلاتا ہے دوسرا وہ پٹھا جو ہم بطور چارا جانوروں کے آگے ڈالتے ہیں جبکہ تیسرا وہ ہے جو اُلوؤں کے خاندان میں پایا جاتا ہے۔منٹو نے اپنے ایک افسانے میں ایسے ہی پٹھے کا ذکر کیا ہے جو ''اُلو کا پٹھا'' ہے۔جس کو کہنے کے لیے وہ دن بھر کوشاں رہتا ہے کہ اس کے ماتحت کوئی ایسی غلطی کریں کہ وہ ان کو ڈانٹ سکے اور اُلو کا پٹھا کہہ سکے مگر بدقسمتی سے دن بھر ایسی کوئی غلطی کسی سے بھی سرزد نہ ہوئی۔ چارو ناچار چھٹی کر کے جب وہ گھر جا رہا ہوتا ہے اور بے دھیانی میں اس کی سائیکل ایک خاتون سے ٹکراتی ہے جس سے وہ زمین پر گر پڑتی ہے اور زمین سے اُٹھتے ہی جو پہلی بات وہ اس سے کہتی ہے وہ اُلو کا پٹھا ہے۔اس طرح اس کے دل کی حسرت ایک خاتون کے ہاتھوں خود اس پر پوری ہوتی ہے۔

اُلو کے بارے میں ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک اُلو درخت پر بیٹھا ہوا تھا، نیچے سے ایک چوہے کا گزر ہوا۔اس نے پوچھا میاں چوہے کہاں جا رہے ہو؟ چوہے نے جواب دیا کہ میں عقل لینے جا رہا ہوں۔اُلو نے کہا ٹھہرو میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔

ہمیں اس کی ذہانت یا بیوقوفی سے فی الحال کوئی کام نہیں ہماری ساری بات ان اُلوؤں کے بارے میں ہو رہی تھی جو اس اُلو کی پیروی میں ہمارے آس پاس چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اُلو ہمارے ساتھ رہتے ہیں یا ہم اُلوؤں کے ساتھ رہتے ہیں۔مگر جب اپنے اردگرد دیکھتے ہیں تو یہ وہ اُلو ہیں جو دن بھر سوئے رہتے ہیں اور جب آدھا دن ڈھلتا ہے تو کہیں آنکھ کھلتی ہے۔اس کے بعد ان کے دن کا آغاز ہوتا ہے اور اُلو کی طرح رات بھر جاگ کر اُلو بن رہے ہوتے ہیں یا دوسروں کو بنا رہے ہوتے ہیں۔سوشل میڈیا کی برکت سے اُلوؤں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے یہ وہ اُلو ہیں جو رات بھر سوشل میڈیا پر ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو اُلو بنانے پر خوش ہو رہے ہوتے ہیں۔رہی بات اُلو کے پٹھوں کی تو یہ وہ چھوٹے چھوٹے اُلو ہوتے ہیں جو عام طور پر تعلیمی اداروں میں پائے جاتے ہیں۔ان کے پاس بڑے اُلو جیسی ذہانت و فطانت کا فقدان

ہوتا ہے۔اسے لیے اُلو کا پٹھا ہونے پر ہی اکتفا کرتے نظر آتے ہیں۔

اُلوؤں کے ساتھ رہتے رہتے معاشرے میں اتنا شعور ضرور آ گیا ہے کہ اگر ان کو بھول بھی جائے کہ وہ اُلو کے پٹھے ہیں تو ان کے آس پاس موجود کوئی دوسرا اُنہیں اُلو کا پٹھا کہہ کر یا مخاطب کر کے ان کی یاد تازہ کروا دیتا ہے۔البتہ ہمیں اس سارے عرصہ میں ڈھونڈے سے بھی کوئی اُلو کی پٹھی نہیں ملی۔دیکھنا یہ ہے کہ کیا اُلو کی پٹھی اُلوؤں کے خاندان میں بھی نہیں پائی جاتی یا وہاں وہ کسی اور نام سے موسوم ہے جو باوجود اُلوؤں پر اتنی تحقیق کے ہم تک اس کی معلومات نہیں پہنچ سکی۔تبھی تو ہمارے ہاں صنف مخالف خود تو کسی کو بھی اُلو بنا سکتی ہے مگر خود اُلو کی پٹھی ہونے سے اب تک بچی ہوئی ہے۔

ہمارے معاشرے کو مردوں کا معاشرہ قرار دیا جاتا ہے اور عورت کو کمزور ترین مخلوق اور مظلوم ترین طبقہ تصور کیا جاتا ہے جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔یہاں کے سارے قوانین اس کمزور ترین کہلائی جانے والی مخلوق کے تحفظ اور دفاع کے لیے ہر جگہ موجود ہیں اور وہ جس کو چاہے اُلو بنا سکتی ہے۔اس کے برعکس مرد کسی بھی عورت کو اُلو نہیں بنا سکتا کیوں کہ اُلو کی کوئی مونث نہیں ہوتی۔

اُلو کے حوالے سے بڑے بڑے ادیبوں اور ماہرین نے لکھا ہے اور اس ساری تحقیق کے نتیجے میں وہ وہ اسے صرف اُلو ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔کسی بھی ادیب نے اس معاملہ میں روایت سے بغاوت نہیں کی ہے۔دوسری طرف اس ساری تحقیق کے باوجود اُلوؤں میں ایسا کوئی تفاخر نہیں پایا جاتا نہ ہی اُنہیں اپنے خاندان میں اتنے سارے بنی نوع انسان کی شمولیت کی کوئی خوشی ہوئی ہے۔اگر یہ معاملہ انسانوں والا ہوتا تو جس طرح الیکشن کے موسم میں ایک جماعت کو چھوڑ کر دوسری جماعت میں شامل ہونے والوں کو بڑے بڑے جلسوں میں ہار ڈال کر اپنی جماعت میں شامل ہونے کی مبارک باد دی جاتی ہے۔ایسے ہی اُلو بھی اپنے اُلوؤں کے بڑے بڑے اجلاس طلب کرتے اور ان جلسوں میں انسانوں کو ہار ڈال کر باضابطہ اُلو ہونے پر مبارک باد دیتے اور اپنی اُلو برادری میں شمولیت پر حرف تحسین پیش کرتے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اُلو ہمارے ساتھ ہیں یا ہم اُلوؤں کے ساتھ

عورت کبھی بدصورت نہیں ہوتی

منٹو نے کہا تھا کہ ''عورت کبھی بدصورت نہیں ہوتی'' جبکہ ہمارا ماننا یہ ہے کہ ''مرد سارے خوبصورت ہوتے ہیں'' بشرطیکہ ان کے پاس اچھا بنک بیلنس، کار، کوٹھی، جائیداد، اقتدار اور سرکاری نوکری ہو۔ عورت کی شادی کی ایک خاص عمر ہوتی ہے اس کے مقابلے میں مردوں کی شادی کی کوئی بھی خاص عمر نہیں ہوتی۔ جس عمر میں اور جس عمر کی عورت سے وہ شادی رچانا چاہیں ان کے راستے میں ملک کا قانون مزاحم ہوتا ہے نہ ان کی بیوی اور نہ ہی معاشرتی روایات۔ لیکن ایسا تب ممکن ہے جب ان کے پاس دولت کی ریل پیل ہو، بڑا سا عہدہ اور کسی بڑے برینڈ کی بڑی سی گاڑی............ جہاں تک بڑی سی گاڑی کا تعلق ہے تو یہ کام رینٹ اے کار والوں نے ویسے ہی بہت آسان کر دیا ہے۔

عورتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''ہمیشہ عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے'' جبکہ مردوں کے بارے میں ایسا تب ہوتا ہے جب دو مردوں کے درمیان کوئی عورت ہو۔ میرا دوست کہتا ہے کہ عورت مرد کی سب سے اچھی دوست ہو سکتی ہے شرط یہ ہے کہ وہ اس کی ''بیوی'' نہ ہو۔ شادی سے پہلے ساری عورتیں خوبصورت ہوتی ہیں، جہاں تک شادی کے بعد کا تعلق ہے تو اس کے بعد وہ شادی شدہ ہو جاتی ہیں۔ جب کہ ہمارا ماننا یہ ہے کہ عورت کی اصل خوبصورتی شروع ہی شادی کے بعد ہوتی ہے۔ اگر شک ہو تو شادی کے چند دن بعد کسی عورت کو دیکھ کر فیصلہ کر لیں۔

کہتے ہیں کہ رزق عورت کے مقدر میں ہوتا ہے اور اولاد مرد کے مقدر میں...... گویا ''ان پڑھ عورت رزق لے کر آتی ہے اور تعلیم یافتہ رزق دیکھ کر......'' جہاں تک شادی کا تعلق ہے تو یہ مردوں کی زندگی کا وہ پچھتاوا ہے جس کے کر لینے کے بعد انہیں احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ تھوڑا سا اور ''صبر'' کر لیتے تو اس سے خوبصورت عورت انہیں مل سکتی تھی۔ بلکہ عین شادی کے دن ہی اس کی ''مردم خیز'' نگاہیں یہ بھانپ لیتی ہیں کہ وہاں آئی ہوئی ساری عورتیں اس کی بیوی سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ تبھی تو بقول یوسفی صاحب ''مرد کی آنکھ اور

عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے''۔ مردوں کی عموماً یہ خواہش ہوتی ہے کہ ایک عورت ان کے ''نکاح'' میں ہو اور ایک ''باہر''۔ جبکہ میرے دوست کے بقول ''بیوی کی صورت میں اسے سب سے زیادہ'' باکردار'' اور دوست کی صورت میں سب سے ''لبرل'' عورت پسند ہوتی ہے''۔

تین چیزیں ہر عورت کی دشمن ہوتی ہیں ''موٹاپا''، ''دوسری عورت'' اور ''سسرال''۔ تبھی تو آج تک کسی بھی شادی شدہ عورت کی ان تینوں سے نہیں بنی۔ بقول یوسفی صاحب کے ''وزن حسن کا دشمن ہے اس لیے ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی چربی کی دبیز تہوں کے خول کو سانپ کی کینچلی کی طرح اتار کر اپنی سہیلیوں کو لگا دے۔'' دوسری چیز دوسری عورت کہ اللہ اس کے شوہر کو دوسری عورت کے ''شر'' سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔ جہاں تک تیسری چیز یعنی سسرال کا تعلق ہے تو وہ سات جنم تک ہمیشہ آباد رہے وہ بھی اس کے ''شوہر کا''۔

جہاں تک مرد اور عورت کی فطرت کا تعلق ہے تو اس معاملے میں مرد ہمیشہ جارح واقع ہوئے ہیں۔ ملک گیری، بادشاہت، راج، مہم جوئی ہمیشہ مردوں کی فطرت میں شامل رہی ہے۔ تبھی تو آج تک ہونے والی ساری جنگیں مردوں نے ہی کی ہیں۔ مگر برا ہو ان حکیموں کا جنھوں نے اس کے باوجود ملک کے چپے چپے میں ''مردانہ کمزوری'' کی تشہیر کر کے مردوں کا ''دم خم'' ہی نکال کر رکھ دیا ہے۔ مجال ہے جو کبھی انھوں نے ''عورتوں کی کمزوری'' کا کوئی اشتہار چسپاں کیا ہو۔ جہاں تک ''جنگوں'' کا تعلق ہے تو عورتیں اس معاملے میں عدم تشدد اور Passive resistance پر یقین رکھتی ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ انسانی میں آج تک ایسی کوئی'' جنگ'' نہیں ہوئی جس میں بلواسطہ یا بلاواسطہ کوئی عورت شامل نہ ہوئی ہو۔

عورت اور بھنڈی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دونوں ''لیس دار'' ہوتی ہیں اور دونوں کو کسی ''دوسری'' کا اشتراک پسند نہیں ہوتا۔ ان دونوں کی اسی مناسبت کی وجہ سے اسے Lady fingure بھی کہا جاتا ہے۔ جبکہ مرد اور آلو کا کوئی حال نہیں ہوتا کبھی آلو قیمہ، کبھی آلو گاجر، کبھی آلو مٹر، کبھی آلو گوشت اور جانے کیا کیا .... یہ دونوں ہر ایک کے ساتھ اپنی ''سنگت'' بنا لیتے ہیں اور مجال ہے جو ذرا بھی برے اور'' بے جوڑ'' لگیں۔

مردوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی عورتوں کے مقابلے میں شرح اموات دنیا بھر میں

زیادہ ہوتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُن کی ''بیوی'' ہوتی ہے جبکہ عورتوں میں کم شرح اموات کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کی کوئی ''بیوی'' نہیں ہوتی۔اسی طرح عورت اگر بیوہ ہو جائے تو ہرا یرا غیرا گزرتے ہوئے اس کا حال پوچھنے آ جاتا ہے۔اس معاملے میں اس کی عدت کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا۔اس کے برعکس اگر مرد رنڈوا ہو جائے تو مجال ہے کوئی عورت اس کے گھر سے سات گھر دور سے بھی گزرے۔

عام زندگی میں مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں اور یہ مکمل گاڑی تب بنتی اور چلتی ہے جب چار بیویوں کی صورت میں چاروں پہیے رواں ہوں اور اکیلا مرد اس کو چلا رہا ہو۔ یہ یاد رہے کہ چاروں پہیوں کے باوجود پانچویں ''سٹیپنی'' کی پھر بھی ضرورت رہتی ہے اور اس کی عدم موجودگی میں ہر وقت یہ کھٹکا رہتا ہے کہ جانے کون سے موڑ پر کون سا ''پہیہ'' مزید ساتھ دینے سے انکار کر دے۔اس حوالے سے میرا دوست کہتا ہے کہ ''شادی کے بعد عورت جس نئے بندھن میں بندھتی ہے اسے دنیا کی جس زبان میں بھی ادا کیا جائے اس کے اعداد چار ہی بنتے ہیں جیسے بیوی، زوجہ، بیگم، پتنی، خانم، wife اور خود ''شادی'' کے اعداد بھی۔ اب اس رشتے کی خوبصورتی بھی تب ہی بنتی ہے جب بیویاں بھی چار ہوں۔''

معاشرے کے اس اہم ترین طبقے کے حقوق اور نگہداشت کے لیے گزشتہ چند عشروں میں جو قانون سازی ہوئی ہے تاریخ کے کسی دور میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔آج عورت جتنی مستحکم empower ہوئی ہے اتنی ماضی میں کبھی نہیں تھی۔ان کی اس آزادی اور بالا دستی کو دیکھتے ہوئے آج مرد بھی عورتوں کے شانہ بشانہ عورتوں کی آزادی اور اس کے حقوق کے لیے ان کے قدم سے قدم اور آواز سے آواز ملا رہے ہیں، عورت مارچ کررہے ہیں۔دیکھنا یہ ہے کہ ان کی یہ ساری جدوجہد عورت کی آزادی کے لیے ہے یا عورت تک پہنچنے کی آزادی کے لیے۔

لنڈا اسٹیٹ

ہمارے کالج میں ایک پروفیسر تھے بڑی اچھی شخصیت کے مالک اپنے مضمون کے ماہر اور محفل میں سب پر چھا جانے والے مگر ان کا پہناوا ہمیشہ لنڈے کا ہوتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں لنڈے کا سوٹ اور بوٹ ان کی شخصیت کا جز ولا ینفک تھا۔ یار لوگوں نے کئی بار ان سے کہا بھی کہ آپ اتنا اچھا کماتے ہیں اتنی اچھی شخصیت ہے۔ اپنے اوپر تھوڑا بہت خرچ کرنا فضول خرچی میں شمار نہیں ہوتا مگر چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی کے مصداق لنڈا کسی صورت ان سے الگ نہ ہوسکا۔ ایک دن شرارتاً ان کے کسی ساتھی نے مزاحیہ انداز میں اخبار میں خبر شائع کرادی کہ ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر اب ج کا پہلا افسانوی مجموعہ ''لنڈے کا بوٹ'' شائع ہو گیا ہے ادبی حلقوں کی پروفیسر موصوف کو مبارک باد۔ جب ان کو اس خبر بارے اطلاع ہوئی تو بڑے جز بز ہوئے دوستوں سے اس بات کا گلوہ شکوہ کیا۔ کئی دن تک تمام دوستوں سے قطع تعلقی رکھی مگر اس کے باوجود لنڈا پہننے کی ان کی یہ عادت ان سے نہ چھوٹ سکی۔

شروع شروع میں اُترن یعنی ''لنڈے'' کی اصطلاح کا استعمال صرف لنڈے کے کپڑوں اور جوتوں تک محدود تھا۔ رفتہ رفتہ یہ عام ہوتے ہوئے ہر ایک شعبہ زندگی تک پھیلتا چلا گیا۔ آٹو موبائل انڈسٹری ہو چاہے ریل و جہاز رانی کی صنعت، زرعی مشینری ہو چاہے صنعتی مشینری ہم سب کچھ ہی تو لنڈے کا درآمد کر رہے ہیں۔ اب بات بڑھتے بڑھتے ''لنڈے کی آنٹیوں'' تک آ پہنچی ہے۔ گزشتہ حکومتوں کے ادوار میں اس رجحان میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ کی آنٹیاں ''سچی محبت'' کی تلاش میں ''مشرق'' اور یہاں کے ''ٹین ایجرز'' ان لنڈے کی آنٹیوں کی کوکھ میں ''اپنا مستقبل'' تلاش کرنے ''مغرب'' کے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کون اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔

ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی لنڈے کی اشیا کا استعمال اب بہت عام ہے۔ یہ رجحان صرف شہروں تک محدود نہیں بلکہ مضافات میں گلی محلّہ تک آپ کو جگہ جگہ لنڈے کے یہ مراکز دکھائی دیں گے۔ پوش علاقوں

کے رہنے والے تو اشیا کے انتخاب میں چنیدہ ہوتے ہیں مگر بیچارے گاؤں دیہات والے بعض اوقات اس حوالے سے مار کھا جاتے ہیں۔اس کا اندازہ چند دن قبل بھرے بازار میں اس وقت ہوا جب ایک ''صاحب'' ''پورن سٹار'' کے لوگو کے ساتھ ایک جیکٹ پہنے بازار میں گھوم رہے تھے اور خواتین اسے دیکھ کر منہ چھپاتی پھر رہی تھی۔

''لنڈے کے لبرلز'' سے ''لنڈے کے منرلز'' تک اور ''لنڈے کے برنلز'' سے اس سے ملتے جلتے تمام ''قافیوں'' تک ہر ایک نے اس ملک کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔تعمیر و ترقی کے اس عمل میں چونکہ پورے ملک کی بیک وقت تعمیر و ترقی ممکن نہ تھی چنانچہ پہلے مرحلے پر سب نے حصہ بقدر جثہ کے اصول کے تحت وطن کی ایک ایک ''اینٹ'' اکھاڑ کر بڑی بڑی سوسائٹیوں میں اور دیارِ غیر میں اپنے گھر اور فارم ہاؤس بنا لیے ہیں۔تعمیر و ترقی کی یہ رفتار یوں ہی تسلسل سے جاری رہی تو بقول علاوہ اقبال:

''میں دیکھ رہا ہوں کہ جس تیزی کے ساتھ یہ بڑی اب ج ہاؤسنگ سوسائٹیاں ملک کے چپے چپے میں قائم ہو رہی ہیں مجھے پورا یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب ان ساری سوسائٹیوں کی اکائیاں جو اندرون اور بیرون ملک قائم ہو رہی ہیں یہ ساری ایک وحدت کی شکل اختیار کر جائیں گی اور یہی اکائیاں ''مملکت خداداد'' کہلائیں گی۔''

ایسے میں صرف کسی ایسے ''مردِ بینا'' کی ضرورت ہے جو Now or Never جیسا کوئی رسالہ جاری کرے اور ان تمام سوسائٹیوں کا سرحرف لے کر اس قائم ہونے والی نئی مملکت کا نام تجویز کرے۔

شرح آبادی کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اس وقت ملک میں ''صنف مخالف'' کی شرح مردوں سے کہیں زائد ہے۔ان میں سے بھی ایک بڑی تعداد ان کی ہے جن کی عمریں ڈھل رہی ہیں اور مناسب رشتے نہ ملنے یا جہیز جیسی فرمائشیں پوری نہ کر سکنے کے باعث گھروں کی دہلیز پر بیٹھی ہیں۔ایسے میں برا ہوا اہل مغرب کا کہ انھوں نے ہمارے ہم وطنوں کی ''نسل'' ہی ختم کرنے کے لیے ''لنڈے کی موم کی دلہنیں'' Silllicone dolls تیار کر لی ہیں جو گھروں میں ان کی ضرورت کے سارے وہ کام کریں گی جو پہلے بیوی سرانجام دیتی تھی۔موم کی ان دلہنوں کی قیمت بھی شادی اور جہیز کے اخراجات سے کہیں کم ہے۔اگر یہ چلن یوں

ہی رہا اور خاص طور پر وہ حضرات جو بیوی کے طعنوں سے ڈرتے ہیں انھوں نے ان موم کی دلہنوں پر کفایت کر لی تو بنی اسرائیل کی طرح جہاں ان اہلِ وطن کی نسلیں معدوم ہونے کا اندیشہ ہے وہیں صنفِ مخالف کا تابناک مستقبل بھی خطرے سے دوچار ہو سکتا ہے۔

ان حالات میں آج کل نئی استعمال ہونے اور تیزی سے مقبول ہونے والی اصطلاحات میں ایک نئی اصطلاح ''کرائے کی کوکھ''(Surrogacy) ہے۔ یہ اصطلاح اُن جوڑوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو کسی وجہ سے اگر بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا پیدا نہیں کرنا چاہتے تو وہ ''لنڈے کی کرائے کی کوکھ'' حاصل کر کے اُس کے ذریعہ بچہ پیدا کروا سکتے ہیں۔ ہمارے ہمسایہ ملک نے اس معاملہ میں بہت تیزی دکھائی ہے۔ بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق حالیہ عرصہ میں وہاں تیس لاکھ کرائے کی کوکھیں موجود ہیں جو ان ضرورت مندوں کو مناسب دام میں سہولیات فراہم کر رہی ہیں۔ ہمارے ہاں اگرچہ اس معاملہ میں اسلامی نظریاتی کونسل اس کے جواز و عدم جواز پر تحقیق کر رہی ہے مگر امکان یہی ہے کہ لنڈے کے کپڑوں و جوتوں کی طرح مستقبل قریب میں ''لنڈے کی کوکھیں'' بھی عوام الناس کو میسر ہوں گی۔ یوں 'ایک گلی کی بات تھی اور گلی گلی گئی' کی صورت گلی گلی تک پھیلتی نظر آئیں گی۔

ہر ملک کی حکومتوں کی اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کے حوالے سے ترجیحات ہوتی ہیں۔ دنیا میں وہی ممالک معاشی طور پر خود کفیل کہلاتے ہیں جو درآمدات کے مقابلے میں برآمدات بڑھاتے ہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ رہا ہے کہ ہم ہاتھ سے کام کرنے والے کو ''کمی'' قرار دے کر کام کی دوڑ سے باہر کر دیتے ہیں اور قائداعظم کے فرمان کام، کام اور کام کو Calm, Calm اور Calm تصور کر کے عوام الناس کو ''خاموش'' رہنے کا درس دیتے ہیں کہ وہ کسی بھی سرکاری معاملے میں Calm رہیں ورنہ اسے ''کارِ سرکار'' میں مداخلت تصور کیا جائے گا۔ چنانچہ سارا انحصار برآمدات پر آ جاتا ہے۔ یہاں بھی حکومتیں عوام کی سہولت اور ان کی تکلیف سے بچانے کے لیے کسی نئی امپورٹڈ چیز کے مقابلے میں ''استعمال شدہ (لنڈا)'' کا مشورہ دیتی ہیں کیونکہ ''چالو' (used) چیز پر طاقت و توانائی کم استعمال ہوتی ہے۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس بات پر حکومت کو مبارک باد دینی چاہیے کہ وہ لنڈے کا زیادہ سے زیادہ استعمال بھی عوامی مفاد میں کر رہی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''لنڈا'' سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے حوالے سے بہت ضروری ہے۔ خاص طور پر وطن عزیز جیسی تیسری دنیا کے لوگوں کے لیے جن کی آبادی کا 70% سے زائد پوش طبقہ سے کم سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ جبکہ مارکیٹوں کی صورت حال اس کے برعکس ہے۔ ''خاص لنڈے'' کی پہنچ تک تو پوش طبقہ ہی پہنچ سکتا ہے اس کی وجہ حکومتوں کا عوامی مفاد میں لگائے گئے پانچ سو گنا سے زائد ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹیاں ہیں۔ جو چیز سرحد پار سو روپے میں دستیاب ہے وہ سرحد سے اس طرف ایک قدم کے فاصلے پر پچاس ہزار میں بھی دستیاب نہیں۔ جو گاڑی باڑ کے اُس طرف ایک لاکھ میں دستیاب ہے وہ عوامی فلاح میں یہاں پچاس لاکھ کی ہے۔ یہ ریٹ کسی ایک چیز تک مخصوص نہیں بلکہ کھانے پینے کی اشیاء سے لے کر عام استعمال کی ہر چیز تک وہاں کے ریٹ یہاں سے کہیں زیادہ کم ہیں۔ اشیاءِ صرف کی ان قیمتوں میں وسیع تفاوت کے پیچھے بڑی حکمت ہمارا اسلامی جمہوریہ اور فلاحی مملکت ہونا ہے جب کہ وہاں سیکولر جمہوریہ ہونا ہے۔ باقی جہاں تک ہمارے ہاں بات رہی ''عام لنڈے'' کی تو وہ ایسا ہے جسے نہ برتا اور پہنا جا سکتا ہے نہ پھینکا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی معاملہ ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' والا آجاتا ہے۔

گزشتہ حکومتوں نے سرحد کے آر پار عوامی مفاد کے استعمال کی اشیا کے تبادلے ''بارٹر سسٹم'' کے لیے قانون سازی کر کے جہاں دوستی بس اور ریل سروس شروع کی تھی وہاں دوستی ٹرک آر پار چیزیں لے جا سکتے تھے۔ یوں ہمیں بھی کیرالہ اور کولکتہ کے کیلے اور ٹماٹر کھانے کو ملے۔ کیلے اور ٹماٹر کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ بیچاری عوام صرف کیلوں پر ہی گزارا کر سکتی ہے ''فار چونز'' اور ''کیا'' تک ان کی پہنچ نہیں ہو سکتی۔ برا ہو آر پار کے کچھ ''مہم جوؤں'' کا جنھوں نے اس تجارت اور آر پار آنے جانے پر کچھ اس طرح پہرے بٹھا دیے کہ آج عام آدمی اس فائدے سے محروم ہے۔ دونوں دیسوں کے ارتقائی سفر کو دیکھا جائے تو جہاں وہ خود کفالت میں آگے گئے ہیں وہیں ہم لنڈے اور کرپشن میں...... ۔ البتہ ایک سبقت ہمیں ان پر ضرور حاصل ہے اور وہ یہ کہ دنیا کی کوئی بھی مہنگی سے مہنگی ''میڈ اِن باڑہ اور راجہ بازار'' امپورٹڈ چیز انتہائی ارزاں نرخوں پر آپ کے من چاہے ملک کے نام کے ساتھ بنی ہوئی ملے گی۔ اس کا دنیا بھر میں کوئی ثانی نہیں۔ یوں لنڈا بھی اگر وطن عزیز میں داخل ہوتا ہے تو وہ بھی برینڈ ناموں کے ساتھ بڑے بڑے برینڈز پر دستیاب ہے۔

گزشتہ ادوار میں ''یوتھ پر'' بہت کام ہوا ہے حتیٰ کہ ایک پوری ''قومِ یوتھ'' ہم نے تیار کر لی ہے۔ یہ یوتھ ہر گلی، محلے، چوک، چوراہے، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے باہر آپ کو نظر آئے گی۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ چھوٹے قد سوکھی ٹانگیں اور ان ٹانگوں پر لپٹی ہوئی جینز نما اترن کے ساتھ کچھ لانگ یا شارٹ پہنے ہاتھوں میں موبائل اور کمر پر بیگ لٹکائے سرتا پا برینڈز (لنڈا) پہنے لنڈے کے لبرلز کی شکل میں دکھائی دیں گے۔ یہ اپنے اس ''مستقبل''، جس کا کوئی ''مستقبل'' نہیں کی تلاش میں موبائل میں اس قدر منہمک ہیں کہ انہیں آس پاس کا کوئی ہوش نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ بقول کسے وہ ''حسرت'' اور ''کثرت'' ہے جو انہیں کسی کام اور مستقبل کا نہیں چھوڑ رہی۔

قحط الرجال کے اس دور میں جہاں ہم ''مرگِ انبوہ'' کا ماتم کر رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں ایک ایک کر کے پچھلی نسل کی ایک ایک نشانی کو ''خاک'' کر رہے ہیں ایسے میں مشروم کی طرح اُگنے والی یہ لنڈے کی ''میڈیائی جنریشن'' کیا ان کا متبادل ہو سکے گی۔ عملاً سرِ شام ٹیلی ویژن پر بیٹھے یہ میڈیائی صحافی اور سوشل میڈیا پر دکھائی دینے والے لنڈے کے دانشور اس ملک کی کایا پلٹنے میں کس حد تک اپنا کردار ادا کر پائیں گے۔

☆☆☆

جدید مردہ بدست زندہ

جس طرح وقت کے ساتھ جینے کے انداز بدلے روایت کی جگہ جدیدیت نے لے لی۔تہذیب و ثقافت حرف غلط کی طرح مٹتی چلی گئی اوراس کی جگہ نئے دور کے نئے تقاضوں نے لے لی۔کچھ ایسے ہی مرنے کے رنگ ڈھنگ بھی وہ نہ رہے۔ماضی میں جہاں مکان کچے اورلوگ سچے ہوتے تھے ایسی ہی ان کی خالص خوراک اور ماحول بھی،نتیجتاً سلسلہ اموات بھی اتنی کثرت سے نہیں دیکھنے کوملتا تھا جیسا کہ اب روزانہ سینکڑوں اموات کی صورت میں ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔تب زندگی سہولیات کی کمی کے باعث مشکل ضرورتھی جس کی وجہ سے بڑھاپا جلدی آتا اورعموماً طویل ہوتا تھا جبکہ آج کی سہولیات بھری زندگی نے جینا آسان کردیا ہے مگر اچانک ہی بندہ ''ہے'' سے ''تھا'' ہوجاتا ہے۔

ایک دورتھا جب کہیں کوئی مرجاتا تو پورے علاقے میں سوگ طاری ہوجاتا اور''بیوہ'' ہی نہیں تمام محلّہ اورساراگاؤں''سوگ'' مناتا اورگویا''عدت'' میں ہوجاتا تھا۔خوشیوں کے تہوار مختصر کردیے جاتے۔شادی بیاہ کی رسمیں موقوف کردی جاتیں۔اپنے پرائے سب ہی مرحوم کے سوگ میں شریک رہتے۔چہلم تک رات بھر اہل محلّہ ماتم والے گھر''راتیں نکلواتے''۔اہل محلّہ میں سے مختلف''پرسوز'' احباب کی خدمات حاصل کی جاتیں اوررات بھر''قصہ گلزار یوسف'' اور''قصہ ہیروارث شاہ'' اور''سیف الملوک'' ترنم سے مردوزن سنتے اورسر دھنتے۔اس شعر پر بھی رنج والم کا اظہار کرتے جو یوسف وزلیخا کے ہجر کی کیفیات پرمبنی ہوتا اوراس پر بھی جس میں ان کے وصال کا تذکرہ ہوتا۔''نینداورتھکن'' بیٹھنے والوں کا براحال کرتی مگر مجال ہے کہ گلزار یوسف کے احترام میں کوئی وہاں سے اُٹھ سکتا۔سو یوں ہی اُونگتے ،جاگتے رات تمام ہوتی۔یہ تو حال اُن کا ہوتا جو دوسرے گھروں سے آتے تھے رہے بیچارے گھر والے تو ان کا ان چالیس دنوں میں جینا محال ہوجاتا۔نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق نہ دن کوچین ملتا نہ رات کوآرام۔بیچاری عورتیں چائے بنا بنا کراورمرد چائے پلا پلا کرتھک جاتے۔

پھر وقت نے کروٹ لی روایت کی جگہ جدیدیت نے لے لی نسل نو جو

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں

بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

کے مصداق ہر چیز کو ''جائز'' اور ''ناجائز'' کی کسوٹی پر پرکھنا شروع ہوئی تو پہلا حکم جو صادر ہوا وہ یہ تھا کہ ''سوگ'' صرف بیوہ کے لیے ہوتا ہے کہ وہ چار ماہ تک سوگ میں رہے اہل محلّہ اس سے بری الذمہ ہیں۔ دوسرا ''رسم جنازہ'' کو زیادہ بہتر اور خوش اسلوبی سے نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک ''مردہ کمیٹی'' کا آغاز کیا جائے جو ہر محلے اور گاؤں کی سطح پر ہر گھر سے ماہانہ بنیادوں پر کمیٹی کی شکل میں وصول کی جائے گی۔ اس محلّہ سے کسی بھی شخص کی وفات پر جہاں مرحوم کی تجہیز و تکفین کے اخراجات اس کمیٹی کے ذمہ ہوں گے وہیں اس موت پر آنے والوں کے اعزاز میں ''ضیافت'' کا اہتمام بھی کمیٹی کی ذمہ داری ہوگی۔ پہلی بات کی حد تک تو اتفاق ہے کہ امداد باہمی کے اصول کے تحت امیر و غریب کی تفریق مٹانے کے حوالے سے یہ اچھی کوشش ہے مگر جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے تو وہ اتنی تیزی سے اب معاشرے میں سرایت کرتی جا رہی ہے کہ مردہ ابھی گھر میں پڑا ہوتا ہے کہ ٹینٹ قناطیں لگنا شروع ہو جاتی ہیں۔ بہترین سے بہترین کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے، گھر والوں سمیت سب کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی کھانے سے نہ رہ جائے۔

رہی بات بیچارے اس مردے کی تو وہ زندوں کے رحم و کرم پر پہلے بھی تھا مگر اب تو سب کا سب ان کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ جوں ہی اس کی روح قبض ہوتی ہے فوراً ہی اس کے اہل و عیال کے سوشل میڈیا اکاونٹس سے Heart broken کی ایموجی کے ساتھ یہ دردناک خبر فالورز کو شیئر کی جاتی ہے کہ ''بیچارے مرحوم'' اللہ کے حضور پیش ہو گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے تمام فالورز اور فرینڈز بھی مرحوم کی ایک عدد سیلفی کے ساتھ جو انہوں نے اسی خاص موقع کے لیے اپنے موبائل کی گیلری میں محفوظ رکھی تھی یہ دردناک خبر شیئر کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے حضور پیش ہو گئے۔ اس تسلسل کے ساتھ تمام میڈیا اکاونٹس سے ان کی اللہ کے سامنے ''پیشی'' کی خبر پھیلائی جاتی ہے کہ فوراً ذہن میں خیال آتا ہے کہ مرحوم آخر اللہ کے ہاں کیوں ''پیش'' ہوئے ہیں۔ اپنے لواحقین کا کوئی کیس لے کر پیشی پر حاضری ہے یا ان کے خلاف اللہ کی طرف سے کوئی ''پیشی'' ہے

جوان کو یوں حاضر کیا گیا ہے ۔سوشل میڈیا پر لوگوں اور لواحقین کی یہ تشہیر او راعلان بالکل ویسا ہوتا ہے جیسے کسی چینل کی بریکنگ نیوز کے ''فلاں سیاست دان سپریم کورٹ کے سامنے پیش ہو گئے'' یا کسی عدالت کے ہرکارے کی پکار جو وہ عدالت کے باہر آواز لگاتے ہوئے کہتا ہے کہ ''فلاں بن فلاں حاضر ہو..................۔''

دوسرا طبقہ ان فالورز اور فرینڈز کا ہوتا ہے جنہیں مرحوم کی پیشی سے کوئی غرض نہیں ہوتی لہذا وہ ''رضائے الٰہی'' اور ''قضائے الٰہی'' کی بحث میں پڑ جاتے ہیں ۔ان کی ان پوسٹوں کو دیکھ کر بندہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کہ اس بندے کے مرنے میں آخر اللہ کی کیا ''رضا'' تھی ۔ یہ تو صرف اس کی ''قضا'' تھی جو آئی اور اسے لے کر چل دی۔ہم تو باز آئے اس رضا اور قضا کی بحث سے۔

سوشل میڈیا پر ٹاپ ٹرینڈ اور خبروں کی زینت رہنے کے بعد یہ مردہ رفتہ رفتہ اپنے اگلے سفر پر روانگی کی تیاری کرتا ہے۔ یہاں بھی حقیقی اور روایتی کی بجائے جدیدیت دیکھنے کو ملتی ہے۔گھر والوں کو مردے کے غم سے زیادہ اس بات کی فکر لاحق ہوتی ہے کہ آنے والوں کو کہاں بٹھایا جائے، ہر ایک سے فرداً فرداً کیسے ملا جائے تا کہ کل کسی کا شکوہ نہ ہو کہ ہم آپ کے گھر آئے تھے آپ نے ہمیں پوچھا اور بٹھایا تک نہیں۔

جنازوں پر جانا خواتین کا محبوب مشغلہ ہے اور وہاں جانا وہ فرض عین سمجھتی ہیں ۔اس کے لیے انھوں نے پہلے سے تیاری کی ہوتی ہے۔ ماتمی لباس میں ''پہاجی'' کے طور پر مرحوم کے غم کو اپنا غم سمجھنے کے لیے منہ پر چادر ڈال کر چند پل اونچی آواز میں بین (بُگیاڑنا) اور ماتم کرنا اور پھر اچانک سے واپس کارِ دنیا میں مصروف ہو جانا............۔درحقیقت ہر ایک جنازے والے گھر کی ساری رنگارنگی اور گہما گہمی انہی خواتین کی مرہون منت ہے۔

اب جنازے کی روانگی کی باری آتی ہے، جنازہ گاہ کو پہلے ہی ہیوی ساؤنڈ سسٹم کے ساتھ آراستہ کیا جا چکا ہے۔مرحوم کے سماجی تعلقات کی مناسبت سے سیاسی وسماجی شخصیات کو جنازے میں مدعو کیا جاتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں نماز جنازہ سے پہلے ''تعزیتی ریفرنس'' کا انعقاد کیا جائے گا۔آج کے اس تعزیتی ریفرنس کے مہمان خصوصی کا انتظار ہے۔ جیسے ہی جنازہ پہنچتا ہے اسے ایک طرف رکھ کر رسمی کارروائی کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک سٹیج سیکرٹری مائیک سنبھالتا ہے اور شرکاء جنازہ ایک ایک کر کے ''مرحوم کے فن وشخصیت'' کے اعتراف میں

مائیک پر حاضری لگاتے جاتے ہیں۔ یہ محض رسمی حاضری نہیں بلکہ مرحوم کی تعریف وتوصیف میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ان مقررین میں وہ بھی ہیں جن کے ساتھ مرحوم کا کسی نہ کسی سطح پر کوئی سماجی تعلق تھا اور وہ بھی جو سرے سے مرحوم کو جانتے ہی نہیں۔اسی طرح دورِ جدید کے یہ تعزیتی ریفرنس صرف مردوں کی حد تک ہی مختص نہیں ہوتے بلکہ خواتین کے لیے بھی باقاعدہ رکھے جاتے ہیں اور مرحومہ کی پارسائی، سماجی تعلقات اور صوم وصلوٰۃ کی پابندی کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

تعزیتی ریفرنس میں گفتگو کرنے والے ان مقررین کا انداز بالکل کسی کتاب کی تقریبِ رونمائی میں اظہارِ خیال کرنے والے اس مقرر کے جیسا ہوتا ہے جو سٹیج پر آ کر کہتا ہے کہ اگرچہ اس نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہے مگر مصنف کی یہ بہت بلند پایہ تخلیق ہے اور اس میں مصنف نے جو عرق ریزی کی ہے اس جیسی کوئی اور تخلیق روئے زمین پر موجود نہیں۔اسی طرح یہ مقررین بھی اس ''مقامِ عبرت'' پر کھڑے ہو کر ساتھ کھڑے کسی شخص سے مرحوم کا نام اور تعارف پوچھتے ہیں اور پھر اس کی تعریف وتوصیف میں وہ مبالغہ کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ............۔

یہ سلسلہ دراز ہوتے ہوتے نمازِ جنازہ کے وقت سے کہیں آگے نکل جاتا ہے۔جنازہ کے شرکاء کو پہلے پتہ ہوتا ہے کہ اُنہیں شدید موسم میں یہ سب سہنا پڑے گا اس لیے احتیاطاً وہ نمازِ جنازہ سے چند منٹ پہلے تک جنازہ گاہ سے دور رہتے ہیں اور محض گنتی کے ہی چند شرکاء جنازہ گاہ میں موجود ہوتے ہیں۔آخری منٹ میں اچانک کہیں سے اتنا بڑا جمِ غفیر جمع ہوتا ہے کہ جنازہ گاہ بھر جاتی ہے۔نمازِ جنازہ سے پہلے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ آج کے ریفرنس کا انعقاد وقت کی کمی کے باعث چونکہ تفصیلاً نہیں ہو سکا لہٰذا مناسب وقت پر دوبارہ ایک اور بڑے ریفرنس کا انعقاد کیا جائے گا۔ان رسومات کے بعد نمازِ جنازہ ادا ہوتی ہے اور اگر ضرورت پڑے تو میت اور نمازیوں کے مسلک کے مطابق الگ الگ دو دو تین تین بار نمازِ جنازہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔نمازِ جنازہ کے فوراً بعد شرکاء اپنے اپنے اس تعلق جس کی نسبت سے وہ جنازہ میں شریک ہوتے ہیں کو ڈھونڈتے ہیں اور اس سے مل کر گویا حاضری لگواتے ہیں کہ میں بھی نمازِ جنازہ میں آیا ہوا ہوں۔

اس موقع پر خصوصی طور پر کوریج اور فوٹوگرافی کے لیے فوٹوگرافر اور صحافیوں کی خدمات حاصل کی

جاتی ہیں۔ الیکٹرانک، پرنٹ اور سوشل میڈیا کے لیے الگ الگ کوریج کی جاتی ہے۔ بڑی بڑی سیاسی وسماجی شخصیات کی جنازہ گاہ میں موجودگی اور جنازہ کے ساتھ خصوصی تصاویر کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سٹیٹس اور ذاتی پوسٹیں لگانے کے لیے شارٹ ویڈیوز کا الگ سے خیال رکھا جاتا ہے۔

رہا بیچارہ مرحوم تو وہ یہ ساری باتیں سن رہا ہوتا ہے اور دل ہی دل میں یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ وہ سارے اوصاف جو یہاں گنوائے گئے ہیں اسے عمر بھر ان اوصاف کی خبر کیوں نہیں ہو پائی۔ دوسرا یہ کہ اگر یہ سب مجھے اتنا دیوانہ وار چاہتے تھے تو مجھے عمر بھر قیدِ حیات اور قیدِ تنہائی میں رکھ کر کیوں مارا؟ ایک ایک وہ خواہش جس کے لیے میری زندگی تمام ہوئی وہ میرے ان چاہنے والوں نے کیوں پوری نہ کی۔

قبر کو تیار کرنے کے لیے جہاں پہلے سماجی طور پر سب مل جل کر اہتمام کرتے تھے وہ رفتہ رفتہ اب ہر گاؤں محلے کے چند لوگوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے ۔اب زیادہ تر لوگ قبر پر آتے ہی نہیں اور جو آتے بھی ہیں وہ ''سفید پوشی'' کے باعث قبر سے دور رہنے میں ہی عافیت جانتے ہیں۔ شہروں میں اس کے برعکس اب دیگر کاموں کی طرح یہ کام بھی اجرت پر لیا جاتا ہے۔ گھر والوں کا کام صرف ان کو اطلاع کرنا ہوتا ہے۔ ان میں سے چند آ کر میت کے غسل اور تجہیز و تکفین کا اہتمام کرتے ہیں جبکہ باقی قبر کی کھدائی اور تیاری مکمل کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک ''مولوی نما'' کی ذمہ داری نماز جنازہ پڑھانا اور قبر پر ''تلقین'' اور دعا کی ہوتی ہے۔ گھر والے اگر متموّل ہوں تو بعض اوقات اس کی ذمہ داری جنازہ پڑھانا کی حد تک ہی نہیں ہوتی بلکہ چہلم تک ''مرحوم کی قبر'' پر سورہ یٰسین پڑھنے اور دعا کی بھی ہوتی ہے۔

نماز جنازہ پڑھ کر زیادہ تر لوگ تو وہیں سے گم ہو جاتے ہیں البتہ ان میں سے چند قریبی اور ہمسائے قبر تک ساتھ آتے ہیں۔ کسی شخص کے چہرے پر دکھ یا غم کے کوئی آثار نہیں، سب اپنی اپنی باتوں اور خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ قبرستان پہنچ کر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کوئی کسی درخت کے نیچے تو کوئی کسی قبر کے پاس ٹولیوں میں کھڑے ہو کر اس آخری مرحلے کے انتظار میں ہیں۔ جنازے کی چارپائی قبر کے پاس لائی جاتی ہے مرحوم کے حقیقی ورثا میں سے دو قبر میں اترتے ہیں۔ قبر پر ایک بڑی سی چادر تان دی جاتی ہے۔ قبر کے آس پاس بہت سے ماہرین جمع ہو کر میت کو قبر میں اتارنے کی لگاتار ہدایات جاری کر رہے ہیں۔ میت کو سیدھا

کریں، چہرہ کھول دیں......   چہرہ تھوڑا قبلے کی طرف پھیریں.....تھوڑا اور...... چہرے اور سر پر بندھی پٹی کھول دیں......پھر اچانک ایک آواز آتی ہے بس اب یہ بالکل سیٹ ہے۔ایک بڑی چادر کسی چادر کے ساتھ باندھ کر میت پر پھیلا دیں تا کہ مٹی کفن پر نہ پڑے......۔سر کی طرف سے تختے دینا شروع کریں......۔

ہر کوئی جلدی میں ہے کہ تختے جلدی جلدی مکمل ہوں تا کہ مٹی ڈالنے کی کارروائی مکمل ہو سکے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہو رہا ہے کہ جو کام گھنٹوں کا لگ رہا تھا منٹوں میں تکمیل پا رہا ہے۔سب کو قبر پر مٹی ڈالنے کی جلدی ہے۔مولوی صاحب دعا میں مشغول ہیں۔قبر پر کس حساب سے مٹی ڈالنی ہے اس کی ہدایات لگاتار جاری ہو رہی ہیں اور قبر پر اتنی مٹی ڈال دی جاتی ہے کہ اب مردہ اگر چاہ کر بھی نکلنا چاہے تو اس ٹنوں مٹی کے بوجھ سے آزاد ہونا ممکن نہیں ۔ادھر دعا ختم ہوتی ہے ادھر لوگوں کے قدم تیزی سے واپسی کی طرف اُٹھ رہے ہیں۔جلدی جلدی قبر کو خالی کرنا ہے کیوں کہ نکیرین نے حساب کتاب بھی شروع کرنا ہے جس کے لیے قبر پر تخلیے کی ضرورت ہے۔

تدفین کے اس عمل کے بعد اگلے چند دن سوگ اور تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہے گا۔ مختلف فوٹوگرافروں سے حاصل ہونے والی تصاویر اور ویڈیوز ملتے ہیں سٹیٹس اپ ڈیٹ کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔مختلف شارٹ ویڈیوز کے ساتھ مرحوم کے ''سفر آخرت'' کے چیدہ چیدہ لمحات اور ان کے ساتھ لگائے ہوئے بیک گراؤنڈ میوزک پر مشتمل سٹیٹس اور وال سٹوریز

ٹر گئے یار محبتاں والے نالے لے گئے ہاسے
دل نی لگدا یار محمد جایئے کیہڑے پاسے

اور

لے او یار حوالے رب دے میلے چار دناں دے
اس دن عید مبارک ہوسی جس دن فیر ملاں گے

سننے اور دیکھنے والوں کو گھر والوں کی دلی کیفیات سے گاہے گاہے آگاہ کرتے جاتے ہیں۔فالورز اور فرینڈز اپنی آسانی کے لیے ان سٹیٹس اور وال سٹوریز پر اپنے تعزیتی کلمات کے ساتھ حاضری لگواتے جاتے ہیں۔ یہ

یاد رہے کہ ہر تعزیت کرنے والے کے لیے ذاتی اور سوشل میڈیا تعزیت بیک وقت ضروری ہے۔ البتہ دور رہنے والے احباب کی طرف سے سوشل میڈیا حاضری کافی ہے اور ذاتی تعزیت سے وہ مستثنیٰ ہیں۔

امیر و غریب کا جو فرق زندگی بھر رہتا ہے مرنے کے بعد بھی یہ فرق قائم و دائم رہتا ہے۔ بیچارے غریب کے جنازے میں بمشکل چند سو اور امیر کے جنازے میں ہزاروں کی شرکت، غریب کے گھر نام کی تعزیت اور امیر کے ہاں باقاعدہ حاضری...... کسی بڑے آدمی کے گھر فوتگی کا مطلب گویا کوئی لاٹری نکلنا ہے۔ انواع و اقسام کے کھانے، مشروبات، ڈرائی فروٹس، حاضرین کے لیے الگ الگ خاص اہتمام اور تعزیت کی کوریج، کوئی زیادہ بڑا افوت ہو جائے تو ساتھ تعزیتی کتاب بھی رکھ دی جاتی ہے جہاں آنے والے کے لیے اس کتاب میں اپنے تاثرات اضافی طور پر قلم بند کروانا ہیں۔

مرنے والا اگر کوئی اعلیٰ افسر یا کسی سیاسی سماجی شخصیت کا قریبی ہو تو پھر جنازہ و تعزیت دونوں میں اس طرح شرکت جس میں اس بڑی شخصیت کے ساتھ بار بار سامنا ہو۔ اس کے برعکس اگر خود وہ شخصیت انتقال کر جائے تو پھر زیادہ حاضری ضروری نہیں کیوں کہ اب اس سے کوئی کام پڑنے والا نہیں۔ قبروں کا حال بھی ایسا ہی ہے مرنے والا کوئی متمول یا بڑے عہدے کا حامل شخص تھا تو اس کی قبر اس کے رتبے اور حیثیت کے مطابق بڑی کر کے بنائی جاتی ہے تاکہ سارے قبرستان میں وہ سب سے نمایاں رہے۔ ایک قبر کی بجائے کئی قبروں کی جگہ گرِل وغیرہ لگا کر اس مردے کے لیے مختص کی جاتی ہے تاکہ زیارت کے لیے آنے والوں کو اس کے مرتبے کا اندازہ ہو سکے۔ یہ قبریں بعض اوقات کئی کئی منزلہ تعمیر کی جاتی ہیں۔ اگر اس طرح بھی ضرورت پوری نہ ہو تو اس کی قبر پر بڑے بڑے گنبد اور مزارات تعمیر کیے جاتے ہیں تاکہ دنیا سے جانے کے بعد بھی مردے کی مادی حیثیت باقی رہے۔

شہروں اور دیہات میں پھرنے والا کوئی مجذوب جسے زندگی بھر کوئی نہیں پوچھتا تھا اگر وہ انتقال کر جائے تو سارا شہر جنازے میں اُمڈ آتا ہے کہ فلاں مردِ قلندر پردہ فرما گئے ہیں۔ بڑے بڑے تعزیتی ریفرنس منعقد کیے جاتے ہیں اور نمازِ جنازہ سے قبل ہی ''فقہاء و مجتہدین'' کی جماعت اسے ''غوث الزماں، قطبِ دوراں، شمس الزماں، فخر اولیا'' اور جانے کن کن القابات سے نواز کر سفرِ آخرت پر روانہ کرتی ہے۔ کوئی ذرا ان

سے یہ تو پوچھے کہ آپ کو کس نے بتایا کہ یہ دنیا سے جانے والا غوث الزماں اور قطب دوراں تھا۔ مان لیا بھئی وہ غوث الزماں تھا تو پھر آپ کیا ہوئے جو اس کو اس بڑے اعزاز سے نواز رہے ہو۔

معاملہ صرف یہاں تک محدود نہیں رہتا موقع پر ہی اپنے ''مسلک'' سے وابستہ کسی شخص کو جس کا اس مجذوب سے تعلق رہا ہو اس کے نائب کے طور پر ''سجادہ نشیں دربار عالیہ فلاں شریف'' کی ''خلعتِ فاخرہ'' سے نواز کر اس کی تاج پوشی کی جاتی ہے ۔اس کے عرس کی باقاعدہ تاریخ کا تعین کر لیا جاتا ہے ۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے ہر گاؤں محلے میں نئے نئے مزارات اور نئے نئے سجادہ نشیں دربار عالیہ معرضِ وجود میں آتے جاتے ہیں اور ان بزرگوں کی کرامات سے وہ جگہ اب ''شریف'' کے لقب سے ملقب ہو جاتی ہے۔

آپ پورے ملک میں گھوم کر دیکھ لیں ایوانِ اقتدار سے گلی محلے تک ''شریف'' کا ٹائٹل آپ کو ہر جگہ دکھائی دے گا۔ ملک میں جاری معاشی بحرانی کیفیات ، زرائع روزگار اور نوکریوں کی کمیابی کے باعث عوام کے پاس کمائی کا واحد ذریعہ ''شریف'' ہی تو رہ جاتا ہے جس پر سب اعتبار کرتے ہیں۔

☆☆☆

سردیاں گرمیوں میں کیوں نہیں آتی

سردیاں ہمیں اس لیے پسند ہیں کہ یہ گرمیوں کا توڑ ہیں اور گرمیاں اس لیے اچھی لگتی ہیں کہ اگر یہ نہ ہوں تو سردیوں سے کیسے جان چھوٹے۔ بھلا ہو دونوں کا کہ ایک دوسری کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ مجال ہے جو ذرا سا آنے میں دیر سویر کردیں۔ ہر وقت ایک دوسری کی تاک میں اور ہر وقت ایک دوسری کا پیچھا کرنے میں سرگرداں............ان سے شکوہ ہے تو بس یہی کہ یہ سردیاں گرمیوں میں کیوں نہیں آتی اور ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ یہ سردیاں گرمیاں نہ ہوئیں ایک دوسری کی سوتنیں ہوئیں اور سوتن بھی وہ جو ازل سے ہیں اور ابد تک یوں ہی رہیں گی۔

دنیا کے مختلف خطوں میں ان کی چال ڈھال ہی نرالی ہے قطب شمالی اور جنوبی کے ساتھ سردیوں کا کچھ ایسا بسیرا ہے کہ وہ منتیں مانتے ہیں دعائیں کرتے ہیں مگر مجال ہے جو سال کے چند مہینے بھی یہ اپنا میکہ چھوڑ کر سسرال کو جائے۔ یہی حال گرمی کا بھی جو خطِ استوا پر رہنے والوں کے لیے کچھ ایسی مہربان ہے کہ پل بھر کے لیے بھی جدا ہونے کا نام نہیں لیتی۔

سننے میں آیا ہے کہ امریکہ، روس اور چائنہ والوں نے اپنے اپنے خطوں میں رہنے والوں کے گرمی کا منہ دکھائی کرنے کے لیے مصنوعی سورج کا اہتمام کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے تا کہ ان مہینوں میں جب ان خطوں کے باسی گرمی کی شکل کو بھی ترس رہے ہوں تو یہ مصنوعی سورج ان کو اجال سکے اور گرمیوں کی آمد تک وہ اس کے دیدار پر گزارا کریں۔

کسی نے جھگی میں رہنے والے کسی سے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ تمہیں سردیاں پسند ہیں یا گرمیاں؟ تو وہ ناگواری سے بولا کہ دونوں پر لعنت ہو نہ سردی چین سے جینے دیتی ہے نہ گرمی کا کوئی توڑ ہمارے پاس ہے۔ مطلب یہ کہ سردی یا گرمی آپ کو تب پسند آسکتی ہے جب آپ کا Chill کا پروگرام ہو۔ اگر آپ گرمی کے ستائے ہوئے ہیں تو شمال یا جنوب کی طرف سفر کریں اور اگر سردی کے ستائے ہوئے ہیں تو خطِ استوا کو اپنا

مسکن بنائیں۔

ہمارا ماننا تو یہ ہے کہ سردی اور گرمی کے تمام احساسات کا تعلق آپ کے جسم کی گرمی سے ہے۔ جوانی اور جولانی ہے تو سردی گرمی ہر ایک کا توڑ ہوسکتا ہے اور اگر قویٰ جواب دے گئے ہیں تو بقول جگی والے کے دونوں پر لعنت ہی بھیجی جا سکتی ہے۔ اعصاب سلامت ہیں تو قطب شمالی اور جنوبی آپ کے پاؤں کے نیچے ہیں اور ماؤنٹ ایورسٹ اور کے ٹو سر کرنا تو گویا ایک کھیل ہی تو ہے اور گرم صحرائے صحارا اور صحرائے گوبی بھی آپ کی پسندیدہ کار اور جیپ ریلی کی جگہ ہے۔ جان تھک جائے تو پھر تنکا بھی بھاری ہے۔

جغرافیائی تبدیلیاں اور سردی گرمی کا کہیں نہ کہیں توڑ ہو بھی سکتا ہے لیکن اگر احساسات پر سردی گرمی آ جائے تو باہر کے تمام موسم بے معنی ہو جاتے ہیں۔ سرد مہری، سرد روی اور اس جیسے ملتے جلتے سارے ہی احساسات رشتوں کے لیے زہر قاتل ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کو خود کسی کام کا نہیں چھوڑتے کیونکہ ان احساسات کا مارا ہوا گرمجوشی دکھانے سے تو رہا دوسروں کے ساتھ گرمی سردی کر سکتا ہے۔ ایسا ہونے کی صورت میں دوسری طرف سے بھی اسے انہی احساسات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یوں دونوں طرف سے سردی یا گرمی کے جذبات صورت حال میں ابال لا سکتے ہیں یا جذبوں پر برف طاری کر سکتے ہیں۔ جس کے توڑ کے لیے ہمارے پاس فی الحال ایسا کوئی مصنوعی سورج نہیں ہے جسے اجال کر ان موسموں کو حدِ اعتدال پر لایا جا سکے۔

اب تو صورتحال یہ ہے کہ جب سے گلوبل وارمنگ نے آ کر ڈیرے ڈالنا شروع کیے ہیں تو سب سے سنی جانے والی موسمیاتی تبدیلی (climate change) ہے۔ اس نے سردی اور گرمی دونوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ لیا ہے۔ ہمارے ہاں وہ مہینے جو موسم سرما کے تصور کیے جاتے ہیں وہ سردیوں کا انتظار کرتے کرتے گزر جاتے ہیں اور جب گرمی کا آغاز ہوتا ہے۔ گرم پہناوے بدن سے اتر کر اگلی سردیوں تک کسی ''وارڈ روب'' یا ''پیٹی'' کا مسکن بننے جا رہے ہوتے ہیں کہ اچانک مغرب سے گھٹا اُٹھتی ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح چھا جاتی ہے کہ مشرق و مغرب بارش اور برف باری میں لپٹ کر جاتی ہوئی سردیوں کو پھر سے روک لیتے ہیں۔ اور یوں گرم پہناوے پھر سے بدن پر چڑھانا پڑتے ہیں۔

اگر بات اتنی سی ہو تو پھر بھی کوئی مسئلہ نہیں مگر صورت حال اس وقت زیادہ گھمبیر ہو جاتی ہے جب

کچھ پہنیں تو گرمی لگتی ہے اور اگر اتاریں تو بدن کانپنے لگتا ہے۔ بلکہ بقول بلاول زرداری'' کا نپیں ٹانگ جاتی ہیں''۔آج جس طرح ہمارے ہاں لنڈے کے ساتھ موسم سرما کا استقبال ہوتا ہے جو نہ صرف ہمارے بدن ڈھانپتا ہے اور سردی کے احساسات سے بچاتا ہے بلکہ حقیقی معنوں میں ہماری''سفید پوشی'' کا بھی بھرم رکھ لیتا ہے۔اور یوں ہم بیک وقت سردی اور سفید پوشی کی شرمندگی سے بچ جاتے ہیں۔اکثر لنڈے کے بارے میں سوچ کر یہ خیال آتا ہے کہ جب دنیا میں''لنڈا''نہیں تھا تو انسان کیسے گزارا کرتے تھے اور سردیوں کا مقابلہ کیسے کیا جاتا تھا۔

میں اس معاملہ میں''اہلِ مغرب'' کی فیاضی کا بہت معترف ہوں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہم اہل مشرق اپنی اضافی اترن (لنڈا) اتار کر اہل مغرب کو بھیجیں تا کہ وہ بھی تن ڈھانپ سکیں مگر وہ ہیں کہ محض ایک''بکنی'' اور انڈرویئیر میں گزارا کر کے اپنا سب کچھ اتار کر ہماری عریانی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے مغرب اور مشرق میں اس معاملے میں جوفرق نظر آتا ہے وہ محض ظاہر و باطن کا ہے۔وہ ہاں ہمیں جوتن کی عریانی نظر آتی ہے وہ ہمارے ہاں من کی عریانی کی شکل میں ہر محلے اور چوک چوراہے میں کسی عفریت کی طرح منہ کھولے اپنی لپیٹ میں لینے کے درپے ہے۔تبھی ہمارے ہاں نہ کوئی تین سال کی بچی محفوظ ہے نہ اسّی سال کی بڑھیا، نہ کوئی چھوٹا بچہ محفوظ ہے نہ کوئی آخری سانسیں گنتا بوڑھا۔......

بات سردی اور گرمی کی ہورہی تھی اور

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا

بات پہنچی تری جوانی تک

کے مصداق اہل مغرب کی عریانی تک جا پہنچی۔مگر اس میں بھی ان کا کمال دیکھیں کہ خود عریاں رہ کر بھی ہمیں باقاعدگی سے اپنی اترن (لنڈا) بھیجتے ہیں۔یہ ان کی فیاضی کا صدقہ ہے کہ مشرق والے بھی انتہائی کم داموں میں مغرب کے بڑے بڑے برینڈز پہنتے ہیں۔البتہ گرمیوں میں بھیجے جانے والی اترن (لنڈے) پر ہمیں اس لیے اعتراض ہے کہ وہاں بدن کا جغرافیہ واضح کرنے کے کچھ آڑی ترچھی لکیروں پر مشتمل لباس ہی زیب تن کیا جاتا ہے جو صرف بدن کے جغرافیہ اور اس کی ذیلی اکائیوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی جغرافیائی

خدوخال کی وضاحت کے لیے دیگر جغرافیائی علامات استعمال ہوتی ہیں جو مغرب میں متروک ہیں۔

جغرافیائی اعتبار سے ہم جس خطے میں رہتے ہیں اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قدرت نے یہاں خصوصی فیاضی دکھاتے ہوئے چاروں موسم ودیعت کیے ہیں۔ پہلے پہل تو ایسے ہی تھا مگر جب سے انسان نے زمین کو اپنی مرضی کا ڈھالنے کے لیے غیر فطری تبدیلیاں کرنا شروع کیں تو بہار اور خزاں کی صورت میں یہ دو درمیانی موسم درمیان سے کہیں غائب ہو گئے۔ ہماری معلومات اس معاملہ میں خاصی ناقص ہیں اور اسفارِ عالم کا بھی ہمیں کوئی خاص تجربہ نہیں۔ ہماری ان سیر وسیاحت کے متوالوں سے گزارش ہوگی جو قریہ قریہ بستی بستی فطرت کی تلاش میں سرگرداں پھر رہے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی معلومات کا ہم سے تبادلہ کریں کہ بہار اور خزاں آج کل کس ملک اور دنیا کے کس خطے میں پائے جاتے ہیں۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم گرمی سے نکلتے ہیں تو خزاں دیکھے بغیر سرما میں داخل ہو جاتے ہیں اور ابھی بہار کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں کہ گرمی سر پر آن پہنچتی ہے۔ ہم تو بقول بیدل حیدری

گرمی لگی تو خود سے الگ ہو کے سو گئے
سردی لگی تو خود کو دوبارہ پہن لیا
بیدل لباسِ زیست بڑا دیدہ زیب تھا
اور ہم نے اس لباس کو اُلٹا پہن لیا

اب اس حال تک آن پہنچے کہ لباس کو اتارنے اور پہننے سے رہے بس خود کو ہی خود پر پہن اور اتار کر سردی گرمی کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

گئی رتوں میں سرما کی دل فریبیاں پہاڑوں کی سفید چوٹیوں اور چشموں کی تُنک تابیوں اور رنگا رنگ دسترخوانوں سے آنکھوں کو خیرہ کرنے کرتی تھی۔ اب تو نہ وہ سفید پوش چوٹیاں ہیں نہ وہ گرم چشمے اور نہ ہی وہ خوان اور دسترخوان...... اگر کچھ رہ گیا ہے تو وہ بازاروں میں دور تک پھیلا ہوا اترن (لنڈا)............

سردیاں اور گرمیاں بھی ایلو پیتھک طرز علاج کی طرح ہوتی ہیں جس میں سردی کا علاج گرمی سے اور گرمی کا علاج سردی سے کیا جاتا ہے۔ شاید جس سائنسدان نے ایلو پیتھک ادویات دریافت کیں اس نے یہ

خیال سردی اور گرمی سے لیا ہو۔تبھی تو بخار کی صورت میں ٹھنڈی پٹیاں Cold sponging رکھی جاتی ہیں اور فلو اور نزلہ کی صورت میں گرم سوپ سے تواضع کی جاتی ہے۔ پیچیدہ امراض کی طرح سردیوں اور گرمیوں کے اثرات بھی پیچیدہ ہوتے ہیں۔ بیچارے سردی کے مارے گرمیاں گزار لیتے ہیں مگر ان کے بدن میں موجود سردی کے امراض نکلنے کا نام نہیں لے رہے ہوتے ہیں۔اور ابھی ذرا سے آثار بنتے ہیں تو پھر سردیوں کی آمد کا اعلان............

سردی سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والوں میں بچے اور بوڑھے شامل ہیں جو پل بھر میں نمونیا کا شکار ہو جاتے ہیں اور جس کو بالکل سردی نہیں لگتی وہ ہمارے ہاں برفانی ریچھ اور شادی یا کسی تقریب میں جانے والی خواتین ہیں جو کڑاکے کی سردی میں بھی نازک اندام بدن پر نازک اندام سا لباس زیب تن کیے دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سرد جذبات کو بدن کی حدت سے پگھلا رہی ہوتی ہیں۔

☆☆☆

کتے اور بہت کُتے

ایک محاورہ آپ نے ضرور سنا ہوگا ایک کریلہ دوسرا نیم چڑھا اور اس کا معانی بھی یقیناً آپ کے ذہن میں ہوگا۔لیکن کیا آپ نے کبھی یہ سنا ہے کہ ایک کتا اور اُوپر سے بہت کتا۔ یقیناً نہیں سنا ہوگا اور نہ سننے کی وجہ شاید یہ ہو کہ آپ کا واسطہ کبھی کسی ایسے کتے سے نہ پڑا ہو جو کتا بھی ہو اور اُوپر سے بہت کتا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ مغرب والوں کے پاس جو کتے ہیں وہ محض نام کے کتے ہیں کتا پن یا کتیاپا اُن کو چھو کر بھی نہیں گزرا۔ کتوں کے بارے میں آج تک آپ نے جتنے بھی اقوال سنے ہوں گے وہ سارے اپنی جگہ درست ہوں گے اور تمام احباب کی ان سب اقوال کے حوالے سے اپنی اپنی تحقیق اور مشاہدہ اور شاید کسی حد تک عملی تجربہ بھی ہو۔ اس تمام کے باوجود ہمیں آج تک ایسا کوئی کتا نظر نہیں آیا جو کتا تو ہو مگر کتا نہ ہو۔

کتوں کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کے انسان کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کتوں اور انسان نے ایک ساتھ اپنے ارتقائی سفر کا آغاز کیا مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈارون نے جب انسان کے ارتقائی سفر کو بیان کیا اور بندر سے انسان تک کے اس ارتقائی سفر میں کروڑوں سال کا ارتقائی زمانہ ڈال دیا وہیں کتوں کے بارے میں جانے کیوں وہ بتانا بھول گیا یا شاید اس کی بھی کتوں کے ساتھ نہیں بنتی تھی۔ اس لیے اس نے شعوری طور پر کتوں کا شجرہ نسب بتانے سے گریز کیا۔

ہم نے تو کسی اسرائیلی روایت میں پڑا تھا کہ جب عزازیل (ابلیس) نے آدم کے پتلے پر حقارت سے تھوک دیا تھا تو جبرائیل نے اس تھوک والی جگہ سے مٹی نکال لی جس سے بعد ازاں کتے کی تخلیق ہوئی۔ اس کی مٹی میں آدم کے خمیر کی وجہ سے آدم سے انسیت کا وصف پایا جاتا ہے اور ابلیس کے تھوک کے اثرات اس کے کتا پن کی علامت ہیں۔ سو آدم و ابلیس نے جہاں ایک ساتھ دو مختلف جہتوں میں اپنے ارتقائی سفر کو آگے بڑھایا وہیں ساتھ ساتھ کتا بھی ارتقائی سفر میں آدم کا مونس و رفیق ٹھہرا۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ انسان نے اپنے ارتقائی سفر کا آغاز غاروں سے کیا اور پھر وہاں سے ہوتے ہوتے جدید گھروں اور آبادیوں میں اپنے بسیرے تک بھی کروڑوں سال لیے ہوں گے۔ اس لیے

اسے غاروں میں رہتے ہوئے یقیناً اپنی رفاقت اور حفاظت کے لیے کسی ایسی مخلوق کی ضرورت ہوئی ہوگی جس میں کتا پن کے اوصاف موجود ہوں ۔ سو حضرت انسان کی نظر گھوم پھر کر کتوں پر پڑی ہوگی مگر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ کیا کتوں میں کتا پن کی خصلت ازل سے تھی یا حضرت انسان کی صحبت نے اس میں کتا پن پیدا کیا ہوگا۔ ویسے جنگلوں اور بیابانوں میں رہتے ہوئے حضرت انسان دیگر جنگلی جانوروں کے ساتھ مانوس کیوں نہیں ہوا یہ بھی ایک سوال ہے۔ اس نے دیگر جنگلی جانوروں شیر، چیتا، ریچھ یا بھیڑیے کو اپنا رفیق سفر بنانا کیوں پسند نہیں کیا۔ کیا وہ کتوں سے زیادہ کتے تھے یا ان میں کتوں جیسی وفا والی کمی تھی کچھ تو اس بات میں حقیقت ہوئی ہوگی۔

جہاں تک ذاتی تجربے کا تعلق ہے اپنا واسطہ تو جب اور جہاں کسی کتے سے پڑا ہم نے اس میں ''کتیاپے'' کے علاوہ کچھ نہیں پایا۔ سو کتوں کے بارے میں ہماری رائے کبھی بھی ایسی نہ ہو سکی جو کتوں کے حق میں جاتی ہو۔ ہم نے تو اسے ہمیشہ اپنا ازلی دشمن ہی پایا۔ جب کہیں کتوں پر نظر پڑی ٹانگوں میں غیر مرئی قوت جاگی اور پوری قوت کے ساتھ ہم نے بھاگنے کو ہی ترجیح دی ہوگی یا پھر ہاتھ اپنے دفاع کے لیے بے ساختہ زمین پر کسی پتھر یا روڑے کی طرف بڑھا ہوگا۔ رہا کتا وہ بھی گویا ہماری ہی تاک میں تھا اس لیے جب تک ہم نے میدان کارزار چھوڑا نہیں ہوگا کتے سے جان بخشی ممکن نہیں ہوئی ہوگی۔

اگر کوئی ہم سے پوچھے کے کتوں کا محبوب مشغلہ کیا ہے تو اپنا سیدھا سا جواب یہ ہوگا کہ موٹر سائیکلوں، گاڑیوں اور راہگیروں کے پیچھے بھاگنا۔ گاڑیوں والے تو گاڑی میں ہونے کی وجہ سے اس تکلیف سے بچ جاتے ہیں جن کا شکار بیچارے موٹر سائیکل اور سائیکل سوار ہوتے ہیں۔ جب تک کتوں کی ٹانگوں میں دم ہوتا ہے وہ ان موٹر سائیکل اور سائیکل والوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اور جب تھک جاتے ہیں تو دم لے کر اسی طرح کی نئی منزل کے مسافر بن جاتے ہیں۔ کتے یہ ساری مشقت قانون اعداد کثیر کے تحت کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ان سارے سواروں میں سے چند ایک ایسے ہوتے ہیں جو کتوں کی اس اچانک افتاد کے نتیجے میں خوفزدہ ہو کر غلطی کر بیٹھتے ہیں اور اپنے بچاؤ کی کوشش میں سڑک پر ہی کہیں حادثہ کر کے آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کی عملی تصویر بن جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ بارش میں بائیک پر سفر کرتے ہوئے زیادہ بارش کے سبب ایک مارکیٹ دیکھ کر رکنے کا خیال آیا۔اس لیے کے بارش میں برساتی کے باوجود بھیگنے کے ساتھ ساتھ سردی کی وجہ سے برا حال ہورہا تھا۔ رکنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔اب جو بائیک روک کر پناہ لینے کے لیے مارکیٹ کے برآمدے میں قدم رکھا تو وہاں پہلے سے بارش کی وجہ سے دبکے ہوئے کتوں نے یہ خیال کیا کہ ان پر کوئی آسمانی مخلوق حملہ آور ہورہی ہے ۔اس لیے وہ یک بارگی اس مخلوق پر حملہ آور ہو گئے ۔ بے دھیانی میں جب کتوں کے اس حملے کا احساس ہوا تو اپنے پاس بچاؤ کا کوئی طریقہ نظر نہیں آیا لہذا ہاتھ پاؤں چلانے میں عافیت سمجھی ۔ جب کتوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ ہم نے اپنے سے بڑی مخلوق سے پنگا لے لیا ہے تو وہ اپنے بچاؤ کی فکر میں زور لگانے لگے اور ہم اپنے بچاؤ کی فکر میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔مختصراً کافی دیر کی اس مشقت و ریاضت کے بعد جان میں جان آئی جب کتوں نے بھاگنے میں عافیت جانی۔ یہ پہلا موقع تھا جب کتوں نے کسی جگہ ہم سے شکست کھائی۔

دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا والا محاورہ ہم نے کہیں کسی چھوٹی کلاس میں پڑھا تھا اور ہم ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ بیچارہ دھوبی کا کتا ہوگا جو دھوبی کی محبت میں مارا مارا پھرتا ہوگا۔اس محبت میں کبھی وہ اس کے گھر پہنچتا ہوگا تو کبھی گھاٹ پر۔اور دھوبی کتے کی اس چاہت سے بے خبر کبھی کسی ایک کے گھر کپڑے پہنچا رہا ہے اور کبھی دوسرے کے گھر۔مگر گزشتہ دنوں کسی محقق نے ہمارے علم کی بتی ہی بجھا کے رکھ دی جب اس نے یہ کہا کہ یہ ''کُتا'' نہیں ''کتا'' ہوتا ہے اور کتا اس ڈنڈے کو کہا جاتا ہے جس سے دھوبی کپڑے دھوتا ہے ۔ خیر اس بیچارے کی تحقیق بھی تحقیق ہی تھی اس لیے اس سے کتے کی خصلت پر کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا۔البتہ ہم یہ ضرور سوچنے پر مجبور ہوئے کہ اگر یہ کُتا بھی محض کتا ہی ہوتا تو کتنی آسانی ہوتی۔مخلوق خدا کو نہ اس مخلوق سے کوئی خوف واندیشہ لاحق ہوتا نہ اس کے کاٹے جانے پر لگنے والے چھٹیکوں کا درد سہنا پڑتا۔

انسانوں کی طرح کتوں کی بھی کئی نسلیں ہیں،انسانوں کی یہ نسلیں چاہے حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں حام،سام اور یافث کی نسبت سے ہوں یا دنیا میں موجود کاکیشیائی،منگول،نیگروز،کاپ اور آسٹریلوی نسل کی صورت میں ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف باہم برسر پیکار ہی رہیں ۔اس ساری ایک نسل کی دوسری نسل پر غلبے کی جدوجہد میں کروڑوں انسانوں نے ایک دوسرے کو کتے کی موت مار دیا۔اس کے برعکس کتوں کی جتنی

بھی نسلیں دنیا میں موجود ہیں ان کے بارے میں آج تک راوی خاموش ہے اور جانے کب تک یوں ہی خاموش رہے گا کہ کیا کتوں نے بھی کبھی نسلی تفاخر میں دوسری نسل کو اس بے دردی سے انسانوں کی موت مارا ہے یا نہیں۔

البتہ یورپ والوں نے اس سارے ارتقائی سفر کے تجربات کو مدنظر رکھتے ہوئے کتوں کے ساتھ باقاعدہ دوستی بلکہ رشتہ داری کر لی ہے۔اب صورت حال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیڈروم تک سے اپنے نصف بہتر (better half) کو نکال کر کتے کو better half بنا لیا ہے۔ان کی اس روش کی پیروی میں ہمارے ہاں بھی کچھ گورا نما حضرات نے انسانوں کی جگہ کتوں کو اپنے بیڈروم اور ڈرائنگ روم کا مکین کر لیا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ جس طرح گھوڑی اور گدھے کے ''تعلق'' سے خچر جیسی ''تیسری'' مخلوق تخلیق پائی ہے انسان اور کتے کا یہ سنگم کیا گل کھلائے گا۔اس پر ابھی تحقیق ہونا باقی ہے۔

اس سے یاد آیا کہ انسانوں میں ''تیسری جنس'' کا جو تصور پایا جاتا ہے وہ انسانوں کے بعد ہم نے خچر کے علاوہ کسی جاندار میں نہیں پایا۔گویا سارے جاندار یا تو ''نر'' ہوتے ہیں یا پھر ''مادہ''۔تبھی تو امریکہ کے نو منتخب صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے اقتدار میں آتے ہی تیسری جنس پر پابندی کا بل منظور کر لیا ہے کہ وہ نر بن کر رہیں یا مادہ کوئی اور جنس قابل قبول نہیں ہوگی۔

کسی آدمی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ دوران سفر اسے راستے سے الہٰ دین کا چراغ مل گیا۔وہ خوشی خوشی اسے اپنے گھر لے آیا۔اب جو گھر پہنچ کر اس نے بے دھیانی میں چراغ کو رگڑا تو اندر سے چراغ کا جن حاضر ہو گیا، کیا حکم ہے میرے آقا؟ پہلے تو وہ آدمی جن کو دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوا پھر اپنے عصاب پر قابو پا کر جن کو کھانے پینے کی چیزیں لینے بھیج دیا۔جن پلک جھپکنے میں کھانا لے کر واپس آ گیا اور پھر مخاطب ہوا کیا حکم ہے میرے آقا......؟ آدمی نے اسے گھر بنانے کا کہا جو اس نے پل بھر میں حاضر کر دیا۔آدمی اسے جس کام بھی بھیجتا وہ فوراً کر کے حاضر ہو جاتا اور گویا ہوتا کیا حکم ہے میرے آقا؟

آخر تنگ آ کر اس آدمی نے جن سے کہا تم ایسا کرو باہر جاؤ وہاں میرا کتا بیٹھا ہوا ہے تم اس کی دُم سیدھی کر کے واپس آ جاؤ۔کہتے ہیں اس دن سے آج تک وہ جن واپس نہیں آیا۔امکان غالب یہی ہے کہ وہ

ابھی بھی کتے کی ٹیڑی دم سیدھی کرنے میں لگا ہوگا اور اپنا کام مکمل کر کے ہی حاضر ہوگا۔ اپنا ارادہ یہ ہے کہ اگر وہ واپس حاضر ہوتو اسے اگلا کام یہ سونپا جائے کہ اب کی بار جائے اور کتوں کے اندر سے بھونکنے اور کاٹنے والی دونوں خصلتوں کو ختم کر کے لوٹے۔ مگر اس میں بھی پریشانی یہ ہے کہ اگر بالفرض اس نے ایسا کر دیا اور کتوں کی یہ دو خصلتیں ختم کر دیں تو پھر یہ کتے کہاں کے رہیں گے کیونکہ ان کا کتا ہونا ان کے کتے پن اور ان دو خصائل سے مشروط ہے جس میں اپنی دانست کے مطابق تبدیلی ممکن نہیں۔

☆☆☆

دوسری شادی

دوسری شادی کیوں کی جاتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی شادی کی کامیابیوں کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے دوسری شادی ضروری ہے یا پھر پہلی شادی کی ناکامی کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے دوسری شادی کا ہونا ضروری ہے۔ ہر دو صورتوں میں دوسری شادی کی اس لیے بھی اہمیت ہے کہ وہ پہلی شادی کا تسلسل ہوتی ہے۔ آج تک کی معلوم انسانی تاریخ میں ہم نے کسی ایک بھی ایسے شخص کے بارے میں نہیں سنا جس نے پہلی شادی نہ کی ہو اور وہ براہ راست دوسری شادی کر لے۔ گویا دوسری شادی کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ پہلی شادی لازماً کرے۔ شادی کے بارے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ شادی ایک امتحان ہے، اس حوالے سے بعض کم فہم ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک ہی چانس میں یہ امتحان پاس نہیں کر سکتے اور ان کی "سپلی'' آجاتی ہے۔ اس کمپارٹمنٹ کو پاس کرنے کے لیے دوبارہ شامل امتحان ہونا پڑتا ہے اور یوں وہ دوسری شادی والے بن جاتے ہیں۔

دنیا کی واحد خوش قسمت بیوہ ہوتی ہے جس کا شوہر چاہ کر بھی دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ جتنی بھی شادی شدہ عورتیں ہیں چاہے وہ بیس سال کی ہوں چاہے ایک سو بیس سال کی اُنہیں کہیں نہ کہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر آخری سانس تک اپنے شوہر کی دوسری شادی کا خوف لاحق رہتا ہے۔

ایک این جی او نے دوسری شادی کے حوالے سے مختلف عمر کے مردوں کے درمیان سروے کروایا کہ مرد کو آخر کس عمر تک دوسری شادی کی خواہش رہتی ہے۔ سروے کے مطابق ہر عمر کے مرد کی کسی نہ کسی سطح پر دوسری شادی کی خواہش موجود تھی۔ ایک این جی او کا رکن ایک ۹۰ سالہ بابے کے گھر پہنچی اور اس سے دوسری شادی کے متعلق سوال کیا اور بتایا کہ وہ دوسری شادی کے حوالے سے یہ سروے کر رہی ہے۔ تو بابا جی نے اپنی آنکھوں پر عینک درست کرتے ہوئے کہا ذرا آہستہ بول ساتھ کمرے میں میری بیگم سن لے گی اور یہ بتاؤ کہ دوسری شادی کے لیے مجھے کرنا کیا ہوگا؟

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سارے شادی شدہ مردوں کا پسندیدہ موضوع ہے جس کا تذکرہ وہ بار بار سننا چاہتے ہیں گویا زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

کہا جاتا ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور اگر کوئی زیادہ کامیاب ہونا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ فوراً دوسری شادی کرے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب دو عورتیں وہ بھی شادی شدہ مل کر اپنے شوہر کی کامیابی کے لیے پیچھے ہاتھ رکھیں گی تو سوچیں وہ مرد اوج ثریا سے پیچھے کہیں رکنے کا روادار نہیں ہوگا۔

ویسے دوسری شادی کا دنیا بھر میں کہیں کوئی مسئلہ نہیں وہاں بس آپ کا صاحب حیثیت ہونا کافی ہے اور اگر ایسا ہے تو بے شک آپ چار شادیاں کر لیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس جب ہم اس خطے میں دوسری شادی کا ذکر کرتے ہیں تو یہاں کی سماجی روایات دوسری شادی کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آ رہا ہے غیر اخلاقی طریقے سے بے شک آپ جتنی مرضی خواتین سے تعلق رکھیں مگر دوسری شادی کا کبھی بھول کر بھی نہیں سوچنا ورنہ انارکلی کی طرح آپ کو بھی دیوار میں چن دیا جائے گا۔

ایسے ہی کسی صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جمعرات کو اپنی بیگم کے پاس گئے اور اسے کہا کہ وہ اس کے کپڑے استری کر کے رکھے کل جمعہ کی نماز کے بعد اس کا دوسرا نکاح ہے۔ عورت نے بڑے حوصلے سے اس کی بات سنی اور بغیر محسوس کرائے حکم کی تعمیل کی یقین دہانی کرا دی اور شوہر کو کھانا دیا۔ کھانا کھاتے ہی شوہر آرام کرنے کی غرض سے لیٹا اور سو گیا۔ تین دن کے بعد جب آنکھ کھلی تو ہڑ بڑا کر اُٹھا اور بیوی سے کہا کہ وہ جلدی سے اسے کپڑے لا کر دے اسے جمعہ پڑھنے جانا ہے۔ بیوی نے گھورتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا کہ اس بار جو نیند کی گولی دی ہے تو تین دن بعد اُٹھے ہو آئندہ اگر اس طرح کی کوئی حرکت کی تو ایسا سلاؤں گی کہ حشر کے دن ہی اُٹھو گے۔

مرد اس لیے بھی دوسری شادی کے اکثر خواہش مند رہتے ہیں کہ عورت اور موبائل کے ماڈل کے

بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں گھر لا کر پتہ چلتا ہے کہ اگر تھوڑا سا اور صبر کر لیتے تو اس سے اچھا ماڈل مل سکتا تھا ۔لہذا نئے ماڈل کی تلاش انہیں دوسری شادی اور دوسرے موبائل کے لیے آمادہ کرتی ہے ۔موبائل کی حد تک تو یہ بات ہم مان لیتے ہیں کہ گھر لا کر اور استعمال کر کے اس سے بہتر ماڈل کی خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے مگر عورت کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے ہم کافی محتاط واقع ہوئے ہیں کیونکہ آخر کار ہم نے بھی تو اسی گھر میں رہنا ہے............

ایک صاحب کے بارے میں کہیں پڑھا کہ وہ اپنی بیوی کی قبر پر باقاعدگی سے جاتے اور روزانہ گھنٹوں بیٹھ کر قبر پر پنکھا جھولتے ۔کسی نے ان سے سوال کیا کہ آپ اپنی بیوی سے اتنی محبت کرتے ہیں جو اس کی وفات کے بعد بھی روزانہ قبر پر آتے ہیں اور اس کی قبر کی راحت کے لیے یوں پنکھا جھولتے ہیں ۔اس پر وہ صاحب جھلا کر بولے یار محبت اپنی جگہ مگر میں نے اپنی بیوی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ تمھاری قبر کی مٹی خشک ہونے تک میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔ جانے کون کمبخت روزانہ قبر پر پانی ڈال جاتا ہے اور مجھے گھنٹوں پنکھا جھولا کر اسے خشک کرنا پڑتا ہے۔

مرد اور عورت کے اپنی پہلی شادی کے حوالے سے تاثرات بھی ہمیشہ مختلف رہے ہیں ۔شوہر کو عموماً اپنی پہلی بیوی میں سب خامیاں اور دوسری میں خوبیاں ہی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں اسی وجہ سے وہ دوسری شادی کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس عورت کو دوسری شادی کرنے کے بعد بھی قدم قدم پر اپنے پہلے شوہر کی ہر بات یاد آتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ وہ دوسرے شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے اس کی اچھائیاں دیکھتے ہوئے بھی اپنے پہلے شوہر کو یاد کرتی ہے اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکل جاتا ہے ''ہائے او میریا پہلیا'' اور یہ جملہ اس حد تک مشہور رہے ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی پہلی اچھائی سے نکل کر دوسری مشکل میں پڑتا ہے تو پرانے اچھے وقت کو یاد کرتے ہوئے ہائے او میریا پہلیا کی رٹ لگا تا دکھائی دیتا ہے۔

شادی کے حوالے سے جتنے بھی اقوال ہیں وہ سارے اپنی جگہ کتنے ہی درست کیوں نہ ہوں جغرافیائی حوالے سے ان میں تفاوت پائی جاتی ہے ۔عرب دنیا میں مرد حضرات شاید اتنی دھوتیاں نہیں تبدیل کرتے ہوں گے جتنی وہ اپنی بیویاں تبدیل کر لیتے ہیں ۔ایسا کرنے پر معاشرتی سطح پر ان پر کوئی قدغن بھی نہیں

ہے، بس اتنا ضروری ہے کہ اگر وہ کسی نئی شادی کی طرف جا رہے ہیں تو پرانی کے نان نفقہ کا پیشگی بندوبست کر لیں۔ ویسے بھی وہاں کا طرزِ زندگی ایسا ہے جو وہاں کے رہنے والوں کو ایک سے زیادہ شادیوں کی گنجائش دیتا ہے تبھی تو وہاں کے مردوں اور عورتوں کی اوسطاً بھی درجن بھر شادیاں ہوتی ہی ہیں۔

اہلِ مغرب کے ہاں تو عورت کی مساوات اور حقوق کے جتنے بھی دعوے اور قوانین ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہاں کی عورت شادی کے رشتے کے حوالے سے کوئی زیادہ سنہری تاریخ نہیں رکھتی۔ ایک وقت تھا جب رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں کے ہاں اسے طلاق کی اجازت نہیں تھی اور اسی حال میں وہ اپنی زندگی تمام کر دیتی تھی۔ اس کے برعکس جب آزادیٔ نسواں کی تحریک عام ہوئی تو دوسری انتہا پر پہنچ گئی اور اسے وہ آزادی دی گئی جس کا چشمِ فلک تصور نہیں کر سکتی تھی۔ گویا یہ عورتوں کی آزادی کی تحریک نہیں بلکہ عورتوں تک پہنچنے کی آزادی کی تحریک تھی جس سے مردوں نے خوب ہاتھ رنگے۔ تبھی تو وہاں بچے کی ولدیت اور سرپرست کے خانے میں باپ کی بجائے ماں کا نام لکھا جاتا ہے۔

اس تحریک کا وہاں کے معاشرتی ماحول میں یہ فائدہ ہوا کہ وہاں کے مرد اور عورت نے ایک دوسرے کی جنس کو جنس تک اور کام کو دماغ میں رکھ کر ترقی کی جبکہ ہمارے ہاں ''جنسِ مخالف'' کو ہمیشہ دماغ میں رکھا جاتا ہے اور کام کو ''جنس'' پر۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر ایک درودیوار پر مردانہ کمزوری کی وال چاکنگ دکھائی دے گی اور کیوں نہ ہو جب چوبیس گھنٹے دماغ اس کام میں مصروف رہے گا تو کہیں نہ کہیں تو کمزوری کے اثرات مرتب ہوں گے۔ اس کمزوری کا سب سے زیادہ فائدہ ہمارے ہاں کے نیم حکیموں نے اُٹھایا اور پوری قوم کو مردانہ کمزوری کے کُشتے بیچ کر انہیں کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ FBR والوں کی جانے کیوں آج تک اس طرف نظر نہیں گئی ورنہ تو پاکستان کا سارا قرضہ صرف ان نیم حکیموں پر ٹیکس لگا کر ایف بی آر والے پورا کر سکتے تھے۔

جہاں تک بات رہی ہمارے اس خطہ کی تو جس طرح برصغیر میں آنے کے بعد اسلام ہندو تہذیب سے تمسک کے بعد اپنی اصل ہیت کی بجائے یہاں کے اسلام کی شکل میں ڈھلا اور سینکڑوں فرقوں کی شکل میں کالے، نیلے، پیلے اور جانے کون کون سے رنگوں میں ڈھل کر نئے نئے برینڈز کی شکل میں سامنے آیا وہیں

اسلام کی شادی کی روایات بھی ہندوتہذیب کے سانچے میں ڈھل کر کچھ ایسی شکل میں سامنے آئیں کہ یہاں دوسری شادی کرنا گویا مذہب ترک کرنے کے مترادف ہے۔ایسے میں اگر کوئی بیچارہ دوسری شادی کر لےتو اس کو ایسے دیکھا جاتا ہے جیسے کوئی اچھوت ہو۔عورتوں کی نظر میں تو ایسا مرد واجب القتل اور گردن زدنی ہے جس کے زندہ اور باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں۔رہا وہ بیچارہ تو دوسری شادی کرنے کے بعد وہ اس طرح دو بیویوں کے پاٹے میں آتا ہے جیسے گیہوں چکی کے دو پاٹوں میں آ کر پستا ہے۔

ہماری ذاتی رائے میں تو دوسری شادی کی اسلام اور دیگر مذاہب کی اجازت اپنی جگہ، جس معاشرے اور ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں کی روایات کے مطابق دوسری شادی کی تمام تر گنجائش کے باوجود ہماری اس تحریر کو دوسری شادی کا اجازت نامہ ہرگز نہ خیال کیا جائے ۔ یہ تمام آرا مصنف کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں کوئی بھی دوسری شادی کا خواہشمند سب سے پہلے سیفٹی فرسٹ کے اصول کے تحت اپنے تحفظ اور بچاؤ کو یقینی بنا کر دیگر تمام ایک سے زائد شادیوں والے احباب کے تجربات کو مدنظر رکھ کر پھر اس نیک راہ میں قدم بڑھائے۔قرآئن کے مطابق دوسری شادی اس لیے بھی ضروری ہے کہ کہا جاتا ہے کہ مرد کا رزق عورت کے مرہون منت ہوتا ہے اور یقیناً ہر مرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے رزق میں بے پناہ اضافہ ہو۔ اس اضافہ کا آسان ذریعہ صرف اور صرف ایک سے زائد شادیاں ہی ہوسکتی ہیں جتنی زیادہ شادیاں ہوں گی اتنا وسیع رزق ہوگا۔

☆☆☆

بلی شیر کی خالہ ہے

بلی ایک گوشت خور ممالیہ جانور ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آج سے دس ہزار سال قبل انسانوں کے ساتھ مانوس ہوئی۔اس کی کتنی اقسام ہیں اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں ایک اندازے کے مطابق پوری دنیا میں بلیوں کی لگ بھگ 38 اقسام ہیں جب کہ پاکستان میں اس کی چھ کے قریب اقسام پائی جاتی ہیں۔ عام طور پر ہمارے ہاں اس کی دو ہی اقسام پائی جاتی ہیں ان میں سے ایک جنگلی بلیاں اور دوسری پالتو بلیاں ہیں۔ بلی کے خاندان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا شمار گوشت خور جانوروں میں چھوٹی اور بڑی بلیوں کے طور پر کیا جاتا ہے۔ بڑی بلیوں میں شیر، چیتا، تیندوا اور باگ جبکہ چھوٹی بلیوں میں وہ بلیاں شمار ہوتی ہیں جو ہمارے آس پاس پائی جاتی ہیں۔

تمام معلوم تاریخ کو کھنگالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت انسان نے بلیوں کو اس لیے مانوس کیا اور اپنے گھروں میں جگہ دی کہ وہ چوہے کھاتی ہیں اور اس طرح بلیوں کی مدد سے اناج کو چوہوں اور دیگر حشرات سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔مگر شاید انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب بلیاں گھر میں خود انسانوں کی جگہ لے لیں گی۔ یہ بلیاں کس طرح قدیم انسانوں سے مانوس ہوئیں اور جنگل و بیابان چھوڑ کر بستیوں کی باسی بن گئیں۔اسی طرح انہوں نے کیسے انسانوں کی جگہ لے گی ان سب باتوں پر ابھی تحقیق ہونا باقی ہے۔

بلی کو عرف عام میں شیر کی خالہ کہا جاتا ہے۔شیر کی خالہ اتنی چھوٹی کیوں رہ گئی جبکہ اس کے برعکس اس کا بھانجا اتنا جسیم کیوں اور کیسے ہوگیا یہ بھی غور طلب ہے۔دوسری بات کہ ہمارے ہاں خالہ بھانجے کا رشتہ بڑے اعتماد کا تصور ہوتا ہے بلکہ خالہ کو ماسی بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ''ماں'' ''سی'' ہوتی ہے جب کہ بلی اور شیر کے رشتے میں ایسا کیا تناؤ آگیا جو دونوں ایک دوسرے سے اس قدر دور ہوگئے کہ اس کے بعد آج تک بھانجے نے خالہ کی کچھ خبر لی نہ ہی خالہ بھانجے کا حال احوال دریافت کرنے اس کی طرف گئی۔کتنی حیرت کی بات ہے کہ تمام جانوروں میں صرف شیر ہی ایک ایسا جانور ہے جس کی خالہ ہے جبکہ باقی کسی بھی جانور کی خالہ

کے ذکر سے تاریخ کے اوراق خالی ہیں۔

2012 میں برطانیہ میں ہونے والے ایک جائزے کے مطابق وہاں ایک کروڑ بلیاں پائی گئیں جبکہ دیگر ممالک میں بلیوں کی تعداد اس سے کچھ کم و زیادہ ہے۔ یورپ میں خاص طور پر بلیوں کو رکھنے کا رواج دنیا کے دیگر خطوں سے زیادہ ہے۔ وہاں کتوں کے ساتھ ساتھ بلیاں پالی جاتی ہیں۔ کتوں اور بلیوں کے ارتقاء اور تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو کتوں کی تاریخ بلیوں سے زیادہ پرانی ہے۔ کتوں اور انسان کے ارتقاء کی تاریخ ایک جتنی ہے جبکہ بلیوں اور انسان کا تعلق حالیہ ہے اور اس کے آباء واجداد کا تعلق بھی ایسی نسل سے ہے جو سماجی جانور نہیں۔ اسی طرح کتوں اور انسان کے ارتقائی تعلق میں کتوں نے انسان کے ساتھ مل کر اس کو شکار میں مدد دی، اس کے اور اس کے مال و اسباب کی حفاظت کی جبکہ بلیاں غیر سماجی جانور ہونے کے باوجود امور خانہ داری اور داخلی معاملات میں انسان کی مددگار رہیں۔

بلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اکیلا رہنا پسند کرتی ہے اور صرف جنسی ملاپ کے وقت تعلق قائم کرتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو کتوں کے مقابلے میں بلیوں پر کم ریسرچ ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان اور بلی کے تعلقات اتنی مدت گزر جانے کے باوجود پیچیدہ ہیں۔ ایک تحقیق کی رو سے کتوں سے انسان کی محبت کی دیگر وجوہات میں سے ایک وجہ کتوں کے بچوں کا کم عمری میں انسان کے ساتھ دوستی کا رشتہ اور ان کی آنکھ کا ایک پٹھا ہے جس کی جنبش سے وہ اپنے تاثرات بیان کر سکتا ہے اور انسان سے اپنی دوستی کا اظہار کرتا ہے جبکہ اس کے دوسرے رشتہ دار بھیڑیوں میں یہ صلاحیت موجود نہیں۔ اسی طرح بلیوں کی آنکھ میں بھی وہ پٹھا نہیں جس کی وجہ سے جب وہ انسان کو گھورتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بے مروت ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کتے شروع سے ہی آنکھ مٹکا کر کے انسان کے ساتھ تعلق استوار کر لیتے ہیں جبکہ بلیاں آنکھ مٹکا میں ابھی کتوں سے پیچھے ہیں۔ حالانکہ بلیوں کی بلی آنکھوں پر تو لوگ مرتے ہیں۔

بلیوں کے بارے میں بہت سے محاورات ہیں جیسا کہ نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی، بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، اونٹ کے گلے میں بلی، بلی کے خواب میں چھیچھڑے، بلی کے گلے میں گھنٹی، بلیوں اور کتوں کا برسنا، بھیگی بلی بننا، بلی مارنا وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک محاورے کی تہہ میں جانا اور تحقیق کر کے نتائج اخذ

کرنا یقیناً جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہ کام ہم قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں۔

البتہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ نو سو چوہے کھا کر بلی بھلا حج پر کیسے جا سکتی ہے وہ بیچاری تو نو سو چوہے کھا کر اول تو ہل ہی نہیں سکتی اور اگر ہل سکے تو ہولے ہولے چل سکتی ہے وہ بھی گھر کے لان میں۔ ہاں البتہ ہمارے ہاں کام مختلف اداروں سے وابستہ افراد، سیاستدان اور دیگر ذمہ دار جگہوں پر بیٹھے ہوئے ارباب اختیار سب کچھ لوٹ کر اور پورے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا کر ضرور حج اور عمرے پر جانے کو ترجیح دیتے ہیں ۔ بی جمن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی مدت تک چوہا مار مہم میں مصروف رہی اور نو سو چوہے کھا کر جب حج کر کے واپس آئی تو اس نے سبک رفتاری سے چوہوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیے تا کہ دوبارہ حج پر جا سکے۔

کسی بادشاہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے مصاحبین سے سوال کیا کہ عملی تجربے سے ثابت کر کے بتاؤ کہ ماحول اور فطرت زیادہ اہم ہے اور اثر انداز ہوتا ہے یا تربیت؟ جواب کے لیے ایک مہینہ کا وقت دیا جاتا ہے۔ بادشاہ کے ایک مصاحب نے پورا مہینہ لگا کر بلیوں کی شاندار تربیت کی اور تربیت کے بھرپور کرتب دکھا کر حاضرین کو عش عش کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب دوسرے مصاحب کی باری تھی کہ وہ ماحول اور فطرت کو ثابت کرے کہ وہ زیادہ اہم ہے۔ اس نے بادشاہ سے عرض کی کہ میں کل یہ ثابت کروں گا البتہ میری درخواست ہے کہ یہ وزیر بلیوں کا کرتب کل دوبارہ دکھائے۔ بادشاہ نے وزیر کی بات سے اتفاق کیا اور اگلے دن دونوں کو دربار میں طلب کر لیا۔

اگلے دن تمام شرکاء کی موجودگی میں پہلے وزیر نے اپنے فن کا مظاہرہ شروع کیا۔ سب حیرت زدہ تھے کہ بہت سی بلیاں انتہائی مہذب انداز میں منہ میں ایک ایک پلیٹ جن میں موم بتیاں روشن تھیں پکڑے حاضر ہوئیں۔ سب بلیوں کی تربیت کا یہ شاندار مظاہرہ دیکھ رہے تھے اور بلیاں پورے نظم وضبط سے محل کے اندر پریڈ کر کے ایک ایک مصاحب سے داد سمیٹ رہی تھیں۔ اسی اثناء میں دوسرے وزیر نے چوہوں سے بھرا ایک تھیلہ بھرے دربار میں کھول دیا۔ چوہوں کو دیکھتے ہی بلیاں سب کچھ بھول گئیں اور وہ پلیٹیں پھینک کر چوہوں کے پیچھے بھاگیں۔ چوہے کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری طرف بھاگ کر جانیں بچا رہے تھے جبکہ

بلیوں نے اس دوڑ دھوپ میں سارے محل کے انتظام کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔

بادشاہ کو دوسرے وزیر کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ اس سے پہلے کے وہ اس کو کچھ کہتا وہ وزیر کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ بادشاہ سلامت تربیت کی اہمیت اپنی جگہ ہے مگر ماحول اور فطرت تربیت سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ آج اگر تربیت غالب ہوتی تو بلیاں نہ بھاگتیں اب اگر وہ بھاگ رہی ہیں تو وہ اپنی فطرت کے مطابق عمل کر رہی ہیں۔ بادشاہ کی بات اپنی جگہ فی الحال ہمیں یہاں صرف یہ پتہ کرنا ہے کہ وہ تربیت یافتہ بلیاں آج کل کس ملک میں پائی جا رہی ہیں۔ ہمارے ہاں کی بلیاں تو اس معاملہ میں بہت غیر مہذب واقع ہوئی ہیں۔

آدمی کے ڈرنے کے ''لائف سائیکل'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آدمی بیوی سے ڈرتا ہے، بیوی چوہے سے ڈرتی ہے، چوہا بلی سے ڈرتا ہے، بلی کتے سے ڈرتی ہے، کتا شیر سے ڈرتا ہے، شیر ہاتھی سے ڈرتا ہے، ہاتھی آدمی سے ڈرتا ہے اور آدمی بیوی سے ڈرتا ہے۔ اب اگر بلی درمیان میں نہ ہوتی تو نہ تو چوہا بلی سے ڈرتا نہ کتے کو بلی کے بھانجے یعنی شیر سے ڈرنے کی ضرورت پیش آتی اور نہ ہی یہ ڈر سائیکل مکمل ہوتا۔ مگر کیا کریں یہ ڈر ایسی چیز ہے جو جاتا ہی نہیں اور ہمیشہ انسان کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔

ہماری نہ کبھی کتوں سے بن سکی ہے نہ ہی بلیوں سے اس معاملے میں ہم بہت لبرل ہو کر بھی اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ پالتو جانوروں کی اس تاریخ میں کتوں اور بلیوں نے انسانوں کے ساتھ ہزاروں سال کا سفر مل کر طے کر لیا ہے۔ ان دونوں مخلوقات کے درمیان تمام تر مخالفت اور ذاتی پسند و ناپسند کے باوجود کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ مشترک ضرور رہا ہے جو یہ آج تک ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور آئندہ ہزاروں سال تک بھی ایک دوسرے سے دور جاتے دکھائی نہیں دیتے۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ انسان بھی باہم مل جل کر اس ارتقائی سفر کو آگے بڑھاتے جائیں۔

☆☆☆

مرے کہنے میں پٹواری نہیں ہے

پٹواری سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کا استعمال اس آدمی کے لیے کیا جاتا ہے جو زمین سے متعلق کاغذات وغیرہ رکھتا ہے ۔ زمین کی خرید وفروخت میں پٹواری زمین کے کاغذات میں ناموں اور زمین کے متعلق دیگر معلومات کا تبادلہ کرتا ہے۔ برصغیر میں پہلی مرتبہ شیر شاہ سوری کے عہد میں یہ نظام متعارف ہوا جسے بعد ازاں اکبر کے دور میں بھی جاری رکھا گیا۔ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے بعد معمولی ردوبدل کے ساتھ اسی نظام کو نافذ کیا گیا جو قیام پاکستان کے ستتر سال گزرنے کے بعد آج بھی پوری آب وتاب سے جاری ہے۔

پٹواری کا تعلق محکمہ مال سے ہوتا ہے ، جن لوگوں کو زمینوں کے معاملات اور محکمہ مال سے متعلق پٹواری سے واسطہ پڑتا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ پٹواری موضع کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پٹواری کے پاس کوئی لال کتاب بھی ہوتی ہے جس میں وہ اپنا سارا ریکارڈ رکھتا ہے ۔ یہ محکمہ مال میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے دوسرے لفظوں میں سارا محکمہ مال صرف ایک پٹواری کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علاقے کے چھوٹے سے چھوٹے بندے سے بڑے سے بڑے آدمی تک اس سے بنا کر ہی رکھتا ہے۔

کوئی بھی حکومت ہو ملک میں کسی بھی طرح کی ہنگامی صورت حال ہو سب سے پہلی نظر انہی پر پڑتی ہے اور اُوپر سے آنے والی ساری امداد انہی کے دست مبارک سے عام آدمی تک پہنچتی ہے۔ کوئی الیکشن کرانا ہو قرعہ فال انہی کے نام نکلتا ہے اور گراس روٹ لیول پر ہوتے ہوئے یہ صرف الیکشن کا پرامن اور شفاف انعقاد ہی یقینی نہیں بناتے بلکہ کس کو کامیاب کرنا ہے یہ بھی ان کو پتہ ہوتا ہے ۔ ہمارے ایک جاننے والے ہیں کسی بات پر ان کی پٹواری سے ان بن ہو گئی ۔ کافی وقت گزرنے کے بعد ایک دن وہ اپنی زمین کی نقل کے لیے پٹواری کے پاس گئے اور پٹواری کو زمین کی نشاندہی کے لیے ساتھ لائے تو پتہ چلا کہ ان کی خسرہ نمبرز مین اصل جگہ سے دور نیچے نالے میں درج ہے جب کہ جو زمین ان کے زیر قبضہ تھی وہ کاغذات میں کسی اور کی ملکیت تھی۔

یوں تو پٹواری محکمہ مال کی اصطلاح ہے لیکن اگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو سارا ملک ہی ''پٹواریوں'' کے رحم وکرم پر ہے۔ چاہے یہ اصطلاح اس کے اصل معنوں میں استعمال ہو چاہے مجازی معنوں میں۔ کشمیر سے خیبر تک اور گلگت سے مکران تک آپ کو زمین پر اتنی کوئی اور مخلوق بااختیار دکھائی نہیں دے گی جتنا کہ پٹواری ہے۔ کہنے کو عام سی ملازمت اور معمولی سی تنخواہ پر گزارا کرنے والا پٹواری نہ صرف اپنے اہل وعیال کے لیے دولت وثروت کی علامت ہے بلکہ پورا محکمہ مال ہی پٹواریوں سے قائم ودائم ہے۔ یہ محکمہ مال کا وہ کل پرزہ ہے جس کو اگر ذرہ سا ادھر سے اُدھر کر دیا جائے تو سارے محکمے کا وجود خطرے میں پڑ جائے

ڈاکٹر کی غلطی اگر بندے کو دو گز زمین کے نیچے پہنچا سکتی ہے تو پٹواری کی غلطی سے یہی بندہ بغیر زمین کے کئی گز 'ہوا میں' ہو سکتا ہے۔ اس لیے سب سے بگاڑ کر زندگی گزر سکتی ہے مگر پٹواری سے بگاڑ کر نہیں گزر سکتی۔ ڈاکٹر اور پٹواری میں یہ قدر بھی مشترک ہے کہ دونوں کا لکھا اور فرمایا ہوا کسی عدالت میں چیلنج نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر جتنی فیس بتا دے مریض کے متعلقین کو بہر حال ادا کرنا ہی پڑتی ہے اسی طرح پٹواری کی فیس بھی ادا کیے بغیر خلاصی ممکن نہیں۔ ڈاکٹر اگر ہسپتال کی 50 روپے کی پرچی پر ہزاروں کا نسخہ مریض کو تھما سکتا ہے تو پٹواری کی بھی چند روپے کی نقل کے دام ہزاروں میں ادا کرنا پڑتے ہیں۔

پٹواری کے بارے جو یہ بات مشہور ہے کہ وہ ''رشوت'' لیتا ہے یہ خبر اس کے حاسدین کی پھیلائی ہوئی ہے۔ آپ کسی بھی پٹواری سے حلف دے کر پوچھ لیں اگر اس نے زندگی میں کسی سے ایک روپیہ بھی رشوت طلب کی ہو۔ سائلین خود ہی اس کی شکل دیکھ کر ہزاروں روپے لٹا کر چلے جاتے ہیں۔ وہ حکام بالا کی طرف سے آنے والے ہر سرکاری مہمان کا مالی طور پر میزبان ہوتا ہے۔ یہ رقم اس نے کس طرح پوری کرنا ہے وہ خوب جانتا ہے۔

پٹواری اور ڈاکٹر دونوں کا ملک کی معیشت میں بڑا کردار ہوتا ہے۔ یہاں ملک سے مراد وہ لی جائے جس کا حدود اربعہ پٹواری اور ڈاکٹر کے گھر، زمین اور فارم ہاؤس کے شمال، جنوب، مشرق، مغرب میں شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر آپریشن کرے تو اس سے مریض کی درازی عمر کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور بعض کیسوں میں گائنی وارڈ بھر جاتے ہیں اس کے برعکس پٹواری آپریشن کرے تو آپ کی زمین کے امکانات کم ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی طرح حکومتیں بھی گاہے گاہے آپریشن کرتی رہتی ہیں مگر حیرت انگیز طور پر ان آپریشنوں کے نتائج کم کم ہی سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی آبادی قیام پاکستان کے وقت محض چند کروڑ تھی جو ان آپریشنوں کے نتیجے میں اب چوبیس کروڑ سے تجاوز کر گئی ہے جبکہ سرکاری (خالصہ) اراضی جو اُس وقت لاکھوں ایکڑ تھی کم ہوتے ہوتے اب نام کو بھی باقی نہیں۔

بڑے بزرگوں کو اکثر یہ دعا دیتے سنا ہے کہ اللہ حکیموں اور وکیلوں سے بچائے۔ جدید اصطلاح میں شاید اس سے مراد ڈاکٹر اور پٹواری ہو سکتے ہیں کیوں کہ جن پر ان کی نگاہ ہو جائے وہ ہمیشہ ان کی ''نگاہ'' میں رہتا ہے۔ دائمی مریض ہو یا کسی دیوانی کیس میں پھنسا ہوا کوئی شخص ہمیشہ بغل میں فائلیں دبائے آتا جاتا دکھائی دیتا ہے۔

دنیا کے منظر نامے میں سب کچھ بدل گیا، تحریر و تقریر کے انداز بدل گئے، ناپ تول کے پیمانے وہ نہ رہے۔ روایتی تعلیم اور آلات ضرب و حرب بدل گئے، سائنس و ٹیکنالوجی نے دنیا کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ مگر اس سب کے باوجود اگر کچھ نہیں بدلا تو وہ پٹواری اور ڈاکٹر کا وہ خطِ تحریر ہے جو دقیانوس کے دور سے آج تک اسی طرح جاری و ساری ہے۔ اسی لیے پٹواری کی نقل ہو یا ڈاکٹر کا گورکھی میں لکھا نسخہ ان کے علاوہ کوئی پڑھ نہیں سکتا۔

پٹواری کو اگر اس کے مجازی معنوں میں دیکھا جائے تو وطن عزیز میں حالیہ عرصہ میں متعارف ہونے والی یہ بالکل نئی اصطلاح ہے جو مختصر عرصہ میں کچھ اس طرح مقبول ہوئی کہ سوشل میڈیا پر ٹاپ ٹرینڈز میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ محکمہ زراعت کے جدید ماہرین کے نزدیک یہ پٹواری ملک کے چپے چپے پر ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ سرکاری، نیم سرکاری، پرائیویٹ اداروں اور عام جنتا میں آپ کو ان کی موجودگی کے آثار ملیں گے۔ ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ ''یہ اگر کھاتے ہیں تو لگاتے بھی ہیں''۔ بریانی ان کی پسندیدہ خوراک ہے۔ پٹواریوں کی دریافت کا سہرا یوتھیوں کے سر جاتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ''انسانی دریافتوں'' میں پٹواری اور یوتھیا دو ایسی عظیم دریافتیں ہیں جنھوں نے ایک دوسرے کو دریافت کیا ہے۔ جس طرح مرغی اور انڈے کے بارے میں تحقیق ہو رہی ہے کہ مرغی پہلے آئی ہے یا انڈا، اسی طرح اس بات پر بھی تحقیق ہونا باقی ہے کہ

پٹواری پہلے آیا یا یوتھیا............

جہاں تک اپنی تحقیق کا تعلق ہے تو ہمارے نزدیک پٹواری وہ عظیم ہستی ہے جس کی شان میں شعراء نے قصیدہ لکھے تو تذکرہ نگاروں نے تذکرے کر کے ان کے فن و شخصیت کا اعتراف کیا ہے۔ بقول ضمیر جعفری

جس نے کی پہلے پہل پیائشِ صحرائے نجد
قیس ہے دراصل اس مشہور پٹواری کا نام

اور

میرے کہنے میں پٹواری نہیں ہے
زمیں میری ہے سرکاری نہیں ہے

☆☆☆

عمر رسیدگی

(AGING)

انسان تاریخ کے ہر دور میں AGING (ڈھلتی عمر) کے خلاف نبرد آزما رہا ہے اور اس کو روکنے کے لیے ہر طریقہ کار آزماتا آ رہا ہے۔ اس کے باوجود عمر کی زمامِ کار اس کے ہاتھ سے چھوٹتی چلی جاتی ہے۔ عمر رسیدگی کا سب سے زیادہ فائدہ آج تک حکیموں نے اُٹھایا ہے یا پھر Beautions (حجاموں) نے۔ دنیا بھر میں اتنے بادشاہ، اربابِ اختیار اور دل پھینک حضرات جنگوں میں نہیں مرے ہوں گے جتنے حکیموں کے درازیِ عمر اور مردانگی کے کشتے زیادہ مقدار میں کھانے سے مرے ہوں گے۔ اسی طرح اتنا جانوں کا نقصان ہیروشیما اور ناگاساکی پر ہونے والے ایٹم بم کے حملوں سے نہیں ہوا ہوگا جتنا ان کشتوں کے استعمال کے بعد بدنوں کے ہیروشیما اور ناگاساکی کا ہوا ہوگا۔ اسی طرح ڈھلتے حسن کو واپس لانے کے لیے پلاسٹک سرجنوں اور بیوٹیشنز نے آج تک جتنا مال بٹورا ہے اتنا امریکہ اور برطانیہ کا مجموعی GDP بھی نہیں ہوگا۔

عمر ڈھلنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بدن کا جغرافیہ اپنی اصل جگہ سے سرکنا شروع ہو جاتا ہے۔ جس طرح کائنات کے بارے میں سائنسی نظریات یہ ہیں کہ یہ ایک ہی جگہ ساکن حالت میں نہیں ہے بلکہ اس کے حجم میں تدریجاً اضافہ ہو رہا ہے۔ ایسے ہی ڈھلتی عمر بھی بدن کے قطبین کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہے اور یوں اچھا بھلا گھبرو جوان اور کھلتی کلیاں نومن کی دھوبن کا روپ دھار لیتے ہیں۔

ایک طرف بدن ڈھلتی عمر کے زیرِ اثر شش جہات ترقی کرنا شروع کرتا ہے تو دوسری طرف بالوں کی دلکشی اور رعنائی کی جگہ ان میں چاندی اترنے لگتی ہے۔ اس چاندی سے چھٹکارا پانے کے لیے ان کو بھی سر منہ کالا کروانا پڑتا ہے جو رندر رہے ہوں اور وہ بھی جن کا دعویٰ عفت و پاکدامنی کا رہا ہوتا ہے۔ یوں بالوں کی چاندی دور کراتے کراتے حسن کاری کے مراکز والوں کی چاندی ہونے لگتی ہے۔ آج تک کی سائنسی ایجادات اور دریافتیں بھی بس انسانوں کے سر منہ کالا کرنے تک ہی پہنچ پائی ہیں اس کے لیے کوئی اور ایسی ٹیکنالوجی دریافت نہیں ہو پائی ہے جس سے اس سیاہی سے بچا جا سکے۔ اس تکلیف کا احساس صرف وہی مرد و زن کر سکتے

ہیں جو ہفتہ وار اس مشقت سے گزرتے ہیں۔اس کام میں اگر ایک دن کی بھی پہلوتہی ہوگئی تو اگلے دن بازار سے گزرتے ہوئے انکل جی اور آنٹی جی راستہ دیں کی صداؤں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

کہتے ہیں کہ بڑھاپا ٹانگوں کے راستے بدن میں داخل ہوتا ہے اور ایسا ہوتا بھی ہوگا مگر اس کا ظہور عموماً پیٹ کے راستے ہوتا ہے۔ذرا سی عمر کی گنتی کیا بڑھنا شروع ہوئی توند اس سے دگنی رفتار کے ساتھ ظہور پذیر ہونے لگتی ہے۔افریقہ کے بعض قبائل میں بجا بڑی توند کو خوبصورتی کی علامت سمجھا جاتا ہو، وہاں کی عورت کتنا ہی بڑی توند پر فریفتہ ہوتی ہو مگر یہاں دو طرفہ توندوں میں مسلسل اضافہ زوجین کو ''عملی زندگی'' سے کوسوں دور کر دیتا ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ سلسلہ اتنا دراز ہوتا چلا جاتا ہے کہ بندہ کہیں جا رہا ہوتا ہے اور اس کی توند کہیں اور............حتیٰ کہ اس پھیلتی کائنات کی طرح بڑھتی توند میں بندہ کہیں رہتا ہی نہیں صرف ایک چلتی پھرتی توند رہ جاتی ہے۔راہ چلتے کہیں آپ کی نظر پڑ جائے تو یوں گمان ہوتا ہے کہ کوئی توند جا رہی ہے۔مشتاق یوسفی نے لاہور کی بعض تنگ گلیوں کا جو نقشہ کھینچا ہے کہ وہ اتنی تنگ ہیں کہ اگر ان میں ایک طرف سے مرد آ رہا ہو اور دوسری طرف سے عورت تو درمیان میں صرف نکاح کی گنجائش بچتی ہے۔اب ذرا تصور کریں کہ اگر ایسی ہی کسی گلی کی دونوں اطراف سے کوئی توندیں گزر رہی ہوں تو نکاح کی جگہ کہاں جائے گی۔

مردوں میں ڈھلتی عمر کے آثار دنیا بھر میں جس دوسری جگہ سے نمایاں ہونا شروع ہوتے ہیں وہ عموماً ان کا سر ہوتا ہے۔تیس پینتیس سال کے بعد پیشانی سے جو بالوں کے سرکنے کا عمل شروع ہوتا ہے وہ اگلے دس بیس سالوں میں کانوں کے پیچھے گردن تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔یوں ٹھیک ٹھاک بندہ اگلے چند سالوں میں ''فارغ البال'' ہو کر رہ جاتا ہے۔ گنجے پن کا اس حد تک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ دورِ جوانی میں جو روزانہ غسل کی جگہ لاہوری غسل (سر دھونا) کے خبط میں یہ مرد ذات مبتلا ہوتی ہے وہ سر پر گیلا ہاتھ یا کوئی ''ٹاکی'' وغیرہ پھیرنے سے پوری ہو جاتی ہے اور بندہ سر دھونے سے بچ جاتا ہے مگر اس کا ایک نقصان یہ ہو جاتا ہے کہ چہرے کا جغرافیہ بدل کر کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے اور بندے کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ منہ کہاں سے شروع ہو کر کہاں جا کر ختم ہوتا ہے۔ یوں سارا سر اگر چہرے میں شمار ہونے لگے تو پھر مسح کس چیز کا کیا جائے گا۔

ایسے ہی کوئی صاحب جن کے سر پر محض چند بال تھے حجام کی کرسی پر جا بیٹھے۔ حجام نے ازراہ طنز پوچھا حضرت یہ بتائیں ان بالوں کے لیے آپ کون سا ہیر کٹ پسند کریں گے تو ان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا فی الحال ہیر کٹ کی ضرورت نہیں تم ایسا کرو کہ ان کو رنگ کر کوئی خوبصورت سا ڈیزائن بنا دو۔ مطلب یہ کہ بندے کو زندہ دل ہونا چاہیے بالوں کا کیا ہے بال آتے جاتے رہتے ہیں۔

بڑھتی توند اور گرتے بالوں کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہ روکے نہیں رکتے۔ دونوں میں مشترک بات یہ ہے کہ ایک پیٹ کو پھیلاتی اور دوسری سر کو بڑھاتی جاتی ہے۔ خاندانی طور پر نسل در نسل جو چیزیں جاری رہتی ہیں وہ جہاں ایک طرف موروثی بیماریاں ہیں تو دوسری طرف گنجا پن ہے گویا گنجا ابن گنجا، ابن گنجا............

ایک دور میں دکانوں پر عموماً ایک پوسٹر نظر آیا کرتا تھا جس میں نقد کی حالت اور اُدھار کا انجام دکھایا ہوتا تھا۔ ایک طرف کروفر کے ساتھ بڑی سی شخصیت اور دوسری طرف لاغر سا مہنگائی کا مارا ادھار کے انجام کی عکاسی کرتا لاغر سا بندہ نما انسان .... بالکل ایسے ہی ایک طرف چڑھتی جوانی کے حامل وجیہہ جوان تو دوسری طرف ڈھلتی عمر اور توند و گنج کے مارے بڈھے جوان............

تیسری دنیا کے ممالک اور خاص طور پر ہمارے خطے کا بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ یہاں انسان کے جو کمالات ہیں وہ بھی زوال شمار ہوتے ہیں۔ جو چیزیں اہل مغرب کے ہاں اُلو کے خوش قسمتی کی علامت ہونے سے لے کر گنجے پن تک خوبصورتی اور کمال سمجھی جاتی ہیں ہمارے ہاں وہی چیزیں منفی تاثر کی حامل ہیں۔ آپ گنجے پن کو ہی دیکھ لیجے شمالی افریقہ میں گنجا پن مردانگی کا تاج ہے، برازیل میں شادی سے پہلے مرد کے گرتے بالوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ترکمانستان میں تو دوسری شادی کی اجازت ہی گنجے کو دی جاتی ہے تو ارجنٹینا میں گنجے کی بیوی قابل فخر قرار پاتی ہے اور ان سب کے درمیان وجہ ءگنجا پن مردانگی کا ہارمون (ٹیسٹوسٹیران) کا بہت زیادہ ہونا ہے جو بالوں والے مردوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہاں تمام گنجے مرد عام مردوں کے مقابلے میں زیادہ سمجھدار، بالغ نظر اور سنجیدہ تصور ہوتے ہیں۔

گنجے مردوں سے یاد آیا کہ عورتیں کبھی گنجی نہیں ہوتی، شاید ان کے گنجی نہ ہونے کے پیچھے عوامل میں ایک مردانگی کا فقدان بھی ہے۔ ویسے اگر عورت گنجی ہو جائے تو کتنی بدصورت لگے، اسی طرح اگر اسے ڈاڑھی

اور مونچھیں آ جائیں تو اس کی خوبصورتی کا کیا حال ہو۔ رہے مرد تو وہ چاہے کلین شیو ہوں چاہے ڈاڑھی میں، لمبے بالوں میں ہوں چاہے چھوٹے بالوں میں، گنجے ہوں یا نیم گنجے ان کی خوبصورتی کسی نہ کسی صورت میں باقی رہتی ہے۔

البتہ ڈھلتی عمر کے ساتھ لوگ ویسے نہیں رہتے جیسے اوائل عمر میں ہوتے ہیں۔ چڑھتی جوانی میں جو آنکھ کھلتی ہی نہیں ہوتی وہ اب ہر آہٹ کے ساتھ کھل جاتی ہے اور ایک بار کھل جائے تو رات رات بھر دوبارہ لگنے کا نام نہیں لیتی۔ جھیل جیسی آنکھوں کے سرچشمے سوکھنا شروع ہوتے ہیں تو نیلاہی کے لیے مصنوعی سہارے ڈھونڈنا پڑتے ہیں۔ آئی لینز اور عینک مستقل طور پر ذات کا حصہ بننے لگتے ہیں ستم بالائے ستم

گلی میں اب نکلتی ہے وہ پوتے پوتیاں لے کر
میرے چشمہ لگانے تک وہ اوجھل ہو ہی جاتی ہے

دل کمبخت تو وہی رہتا ہے مگر قویٰ ساتھ نہیں دیتے لہذا ہر گزرتے دن کے ساتھ حال کچھ یوں تصویر پیش کرتا ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہمارے ملک کے تیسرے گورنر جنرل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آخری عمر میں ان کو فالج لقوے اور دیگر بہت سی بیماریوں نے گھیر لیا تھا اس کے باوجود جہاں اقتدار کی ہوس اپنی آخری انتہا کو تھی وہیں پاگل دل پھر سے جوان ہونے کو بے قرار تھا۔ اس بے قراری کو مٹانے اور تنہائی کو بانٹنے کے لیے امریکہ سے ''روتھ بورل'' نام کی خوبصورت سی خاتون معہ اس کی والدہ درآمد کی گئی جو خلوت وجلوت میں ان کی ہمسفر تھی اور جسے نظریہ ضرورت کے تحت پرائیویٹ سیکریٹری کا خطاب دیا گیا تھا۔ اب حال کچھ یوں تھا کہ جسمانی قویٰ نے کام کرنا بالکل چھوڑ دیا اور حالت اشاروں تک آن پہنچی مگر آنکھوں میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی۔ اب ان کا کہا ہوا کوئی سمجھ بھی نہیں سکتا تھا مگر کیا کریں اس دل کا جو سدا کا جوان تھا اور جوان ہی رہنا چاہتا تھا۔

ان ہی اشاروں کنایوں اور بے ربط الفاظ میں جہاں گورنر صاحب نے ملک کے دوسرے وزیر

اعظم خواجہ ناظم الدین کی چھٹی کرا دی، وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کو برطرف کر دیا اور آرمی چیف کو وزیر دفاع کے عہدے پر متمکن کر دیا وہیں ایک دن عجیب وغریب زبان میں کچھ ارشاد فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ طاقت و قوت کی بحالی کے لیے کسی حاذق حکیم کا بندوبست کیا جائے تا کہ کھوئی ہوئی جوانی کو لوٹایا جاسکے اور اس کا کچھ لطف لیا جاسکے۔ ہرکاروں کی دوڑیں لگ گئیں کہ کہیں سے کوئی ایسا حکیم میسر آ جائے جو گورنر جنرل کی کھوئی ہوئی جوانی کو واپس لوٹا سکے۔ بالآخر بڑے غور وحوض اور تحقیق کے بعد لکھنو کے ایک سو پانچ سال کے ایک نابینا حاذق حکیم کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اب جو حکیم صاحب کی ہدایت پر گورنر صاحب کو جوانی اور طاقت کی بحالی کے لیے کشتے، نوزائیدہ بکروں اور چڑوں کے مغز کی یخنی پلانی شروع کی گئی تو گورنر صاحب جو پہلے ہی بلند فشار خون کے مریض تھے اس حدت کی تاب نہ لا پائے اور ایک دن گر کر بیہوش ہوئے اور قومہ میں چلے گئے۔ ان کی صحت کی بحالی کی کئی کوششیں کی گئیں، سرکاری خرچے پر سوئٹزرلینڈ لے جایا گیا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ سو عمر رسیدگی کی بحالی کے اس شوق میں آخر کار جوانی سے بھی گئے، جان سے بھی اور روتھ بورل سے بھی............

کہنا بس اتنا سا ہے کہ جیسے اونٹ کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی ایسے ہی عمر رسیدگی میں اس بڈھے جوان کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں رہتی جو ایک بار ٹیڑھی ہو جائے۔ یہ سلسلہ روز ازل سے یوں ہی جاری وساری ہے اور یوں ہی جاری وساری رہے گا۔ ایک ایسا وقت آتا ہے جب دوائیں خوراک کی جگہ لے لیتی ہیں اور خوراک دواؤں کے طور پر صبح، دوپہر، شام دو دو چمچ تک رہ جاتی ہے۔ یوں عمر رسیدگی ہٹے کٹے آدمی کو کہیں سے کہیں پہنچا کر صبح دوپہر شام کا مہمان بنا کر رکھ دیتی ہے۔

☆☆☆

بجوکا

ایک دور تھا ٹیلی ویژن پر ہمارا پسندیدہ پروگرام پتلی تماشا ہوا کرتا تھا۔ یہ پتلیاں مصنوعی طور پر تیار کی جاتیں جو پردے کے پیچھے موجود ان اشاروں اور دھاگوں پر حرکت کرتیں جو پتلی کے کردار اور ضرورت کے مطابق ان کو حرکت دیتے۔ بالکل ایسے ہی بجوکا یا بجھوکا (Scarecrow) عام طور پر گھاس پھوس یا کسی اور ٹھوس مادے سے تیار کیا گیا وہ ڈھانچہ جسے انسانی شکل دے کر اور لباس اور ٹوپی وغیرہ پہنا کر کھیتوں میں کسان لکڑی کے سہارے نصب کرتے۔ اس انسانی شبیہ کا مقصد کھیت اور فصل کو پرندوں اور آوارہ جانوروں سے بچانا ہوتا۔ جدت نے جس طرح کلاسیکیت کا گلا گھونٹا اسی جدت کے تحت پتلیوں اور بجوکا کے یہ کردار وقت کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتے گئے۔ اب پتلیوں کی جگہ کارٹونوں کی سیریز نے لے لی ہے جبکہ کسانوں کے اپنی فصلوں اور کھیتوں سے دوری نے بجوکا کے کردار کو کہیں پس منظر میں گم کر دیا ہے۔ اس لیے آپ کو خال خال ہی کہیں کھیتوں میں یہ بجوکے نظر آئیں گے۔

تہذیب و ثقافت سے پتلیوں اور بجوکا کے کردار اگرچہ ضرور معدوم ہوئے مگر عملی زندگی پر جب ہم نگاہ دوڑاتے ہیں تو جوں جوں معاشرے میں قحط الرجال عام ہوا حقیقت کی جگہ بناوٹ نے لے لی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر سطح پر جہاں پہلے کوئی مرد بینا اور صاحب امروز دکھائی دیتا تھا اس کی جگہ مختلف سطح پر بجوکوں نے لے لی۔ ہماری یہ دنیا تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرتی رہی ہے اس پر کبھی تو ظالم و جابر حکمران مسلط رہے تو کبھی عادل فرماں رواؤں نے اپنے عدل کی تاریخیں رقم کی۔ ایک وقت تھا کہ طاقتور فرماں روا کمزور ممالک کو طاقت کے زور پر ہڑپ کر جاتے۔ پھر ایک وقت آیا جب دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اقوام متحدہ جیسے ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا اور بزور شمشیر دوسرے ممالک پر چڑھائی اور قبضے کی ظاہری صورتوں کی حوصلہ شکنی کی جانے لگی۔ لہذا گزشتہ اسی سال کے اعداد و شمار کو دیکھا جائے تو دنیا کے بہت کم ممالک پر دوسرے ممالک نے قبضہ کیا یا ان ممالک کے نقشے تبدیل ہوئے ہیں۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ دیکھنے کو ملی ہے کہ اس عرصہ میں طاقتور ممالک

نے کمزور ممالک اور تیسری دنیا کے ملکوں پر خاص طور پر اپنی دھاک اس طرح بٹھائی کہ اب وہاں اگر چہ ظاہراً اُنہی ممالک کے باسیوں کی حکمرانی دکھائی دیتی ہے مگر عملاً دیکھا جائے تو وہاں اصل حق حکمرانی کی بجائے بجوکے دکھائی دیں گے جو ظاہر کے حلیے میں تو اس ملک کے باسی ہیں اس ملک کے مفادات کے محافظ ہیں مگر درحقیقت ان کا اس ملک اور اس کے باسیوں کے ساتھ دور دور تک کا کوئی واسطہ نہیں۔ وہ اگر محافظ ہیں تو ان مفادات کے جو ان کے غیر ملکی آقاؤں نے ان کو تفویض کیے ہیں اور اگر مسیحا ہیں تو ان کے جن کا وہ نمک کھا رہے ہیں۔ بجوکوں کا یہ کردار اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ان کی حکومت قائم رہتی ہے اور جب اقتدار کا سورج غروب ہوتا ہے تو یہ اگلی پرواز کے ذریعے واپس یورپ اور امریکہ کے شہری بن جاتے ہیں۔

اسی طرح اسلامی بلاک اگر چہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا ابلاک تصور ہوتا ہے جو پچپن سے زائد اسلامی ممالک اور ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کا مسکن ہے مگر جب بنظرِ عمیق نگاہ دوڑائیں تو ان کے حکمران حقیقی حق حکمرانی سے کوسوں دور اپنے اپنے آقاؤں کی طرف سے دیے گئے حق حکمرانی کے نمک کا حق ادا کر رہے ہیں۔ عالمی استعمار کے نرغے میں انسانیت کس طرح سسک رہی ہے، مسلمان کس طرح اور کس کس ظلم کا شکار ہو رہے ہیں ان حکمرانوں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

وہ دور گیا جب کسی ایک بیٹی کی پکار پر کوئی محمد بن قاسم سر بکف ہو کر لبیک کہتا ہوا مدد کو آن پہنچتا تھا۔ وہ عہد اب کہیں دکھائی نہیں دیتا جب ایک غیر مسلم دوشیزہ کی مدد کو طارق بن زیاد اپنی کشتیاں جلا کر اپنے وقت کے راڈرک کو چیلنج کرتا تھا۔ اب تو بڑے سے بڑے ظلم پر بھی غیر ملکی آقاؤں کے یہ نمک خوار بجوکے محض ایک منٹ کی خاموشی اور قرارداد مذمت منظور کرتے ہیں۔ کون سا ظلم ایسا ہے جو آج ہر سو بپا نہیں، عدل کا خون کن کن طریقوں سے ہو رہا ہے کس کو کوئی خبر نہیں۔ اگر خبر ہے تو اتنی سی ہے کہ بجوکا کا کام صرف ظاہراً کھڑے رہنا اور اپنا آپ دکھاتے رہنا ہے کہ میں بھی یہاں موجود ہوں باقی جس کے جی میں جو آئے وہ کرے بجوکے میں اتنا دم خم کہاں کہ وہ کسی کا ہاتھ روک سکے۔

بجوکوں کا تعلق صرف غیر ملکی استعمار کے ساتھ منسلک نہیں، قحط الرجال اور نفسانفسی کے اس دور میں ہر شاخ پر جہاں پہلے اُلو بیٹھا کرتا تھا اب آپ کو وہاں بجوکے بیٹھے دکھائی دیں گے۔ آپ کسی بھی دفتر میں چلے

جائیں کسی بھی ادارے کی خبر لے لیں خال خال صاحب امروز ملیں گے جن سے ان اداروں اور دفاتر کی آبرو قائم ہے ورنہ تو بجو کے اتنی کثرت کے ساتھ چارسو پھیل گئے ہیں کہ ان کی موجودگی میں اپنا آپ بھی کبھی کبھی بجوکا لگنے لگتا ہے۔ ہمارے سیاستدانوں نے بھی بجوکوں کی پیداوار میں اہم کردار ادا کیا ہے، ان کے ہاں کسی بھی عہدے پر تعیناتی کے لیے اہلیت کے خانے میں صرف بجوکا ہونا کافی ہے۔ اہلیت سے اس لیے بھی ان کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں کیوں کہ کوئی اہل اگر کسی عہدے پر فائز ہو گیا تو وہ کسی سیاستدان کی کسی غلط بات کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ یہ بجو کے ان صاحبان دل و درد کو بھی روکتے ہیں جو کسی عہدے پر رہتے ہوئے کچھ کرنا چاہتے ہیں، اپنے حصے کی شمعیں روشن کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو اس حد تک مجبور کر دیا جاتا ہے کہ پھر وہ سب کچھ دیکھ سن کر بھی کچھ کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں، زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں، آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ عمار اقبال نے اپنی ایک نظم میں بجوکا کے اسی کردار کو مختلف زاویوں سے پرکھا اور بیان کیا ہے۔

بجوکا ڈرتا ہے

بجوکا تنہا ہے
بجوکا گھاس پھوس کا جسم سنبھالے
کالے کوے پر مرتا ہے
لیکن بات نہیں کر سکتا
اس پر ہے سکتا طاری
نرالہ عشق ہو جیسے
بھوسے کے اک ڈھیر پہ جلتا سیگریٹ چنگاری
بجوکا جلتا ہے
بجوکا پھٹے کوٹ کی جیب ہوا سے بھرتا ہے تو ہنستا ہے
سب آس پاس کے پھول کپاس کے سونگھ سانگھ کے بنجر پن کے
بیج بدن میں بوتا ہے تو روتا ہے

سب کھیت اسی کا ہے وہ پھر بھی ننگا ہے

بجو کا کنگلا ہے

بجو کا کنگلا ہے پر ہوا چلے تو گھوم گھوم کے جھوم جھوم کے

نیند میں کوئی رقص کہیں فرماتا ہے

اور جاگ نہیں سکتا

بجو کا گنگ کھڑا اک جنگ لڑا کرتا ہے

جس سے بھاگ نہیں سکتا

بجو کا لنگڑا ہے

اور اندھا ہے اور بھوکا ہے

پر گیت اسی کے گاتا ہے

جو اس کی آنکھیں نوچ نوچ کے کھاتا ہے

چلاتا ہے پر تھوڑی بھی آواز نہیں کرتا

بجو کا گونگا ہے

بجو کے آگ لگا اس کھیت کو جس پر بس کوئے پلتے ہوں

یوں ہی کائیں کائیں کرتے ہوں

تجھ سے جھوٹ موٹ ڈرتے ہوں

تو کیوں ڈرتا ہے

بجو کا تنہا ہے

سچ تو یہ ہے کہ بجو کا ڈرتا ہے ہر اس بات سے جو وہ کر نہیں سکتا اور ہر اس بات سے جو اس کے اختیار میں نہیں۔ مصلحت کوشی کی یہ ایسی رسم ہے جو جیتے جاگتے انسان کو بجو کا بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اس مصلحت کوشی کے پیچھے کہیں تو اپنی جان کا خوف ہوتا ہے تو کہیں مفادات کے زیر اثر وہ اپنی انا اپنی خودداری کو ترک کر کے اپنا سب

کچھ مفادات کی نذر کر دیتا ہے۔ہمیں اپنے دیس کی زبوں حالی اور انتشار کی جتنی بھی وجوہات نظر آتی ہیں ان میں ایک بڑی وجہ یہی بجو کے ہیں جو اس دیس کو کسی صورت ترقی کرتا دیکھنا ہی نہیں چاہتے اور اگر کہیں ترقی ہوتی ہے تو ان کا بجو کا ہونا ہی اس زبوں حالی کی وجہ بن جاتا ہے۔

☆☆☆

خوش فہمیاں

لوگ گائیں پالتے ہیں، بھینسیں پالتے ہیں، اونٹ پالتے ہیں، مرغیاں اور بطخیں پالتے ہیں۔ غرض ہر وہ چیز جو انسان سے مانوس ہوتی یا پالتو کہلاتی ہے اس کو بنی آدم نے ابتدائے آفرینش سے ہی پالنا شروع کر دیا۔ اس پالنے کے پیچھے جو دیگر عناصر کارفرماں تھے ان میں سے ایک ان پالتو جانوروں سے اپنا ذاتی فائدہ حاصل کرنا بھی تھا۔ اسی بات اور فائدے کی دیکھا دیکھی ہمارے عہد کے ایک حکمران نے اپنے الیکشن کے منشور میں ملک کی تقدیر بدلنے کے منصوبے کا ذکر کیا تھا اور ٹھیک ایک ماہ بعد جب وہ برسرِاقتدار آیا تو اس کا پہلا اعلان اور فرمان یہ تھا کہ ساری قوم ''کٹے اور مرغیاں'' پالے اور بلین ٹری منصوبے کے تحت ایک ارب درخت لگا کر ان درختوں کے سائے میں کٹے اور مرغیاں چرائے۔ اس طرح کٹوں اور مرغیوں کے لیے جہاں ذرائع خوراک دستیاب ہوں گے وہیں ساری قوم اس کام میں مصروف ہو کر دنیا کی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کر لے گی۔

مگر ان سب چیزوں کو پالنے میں وہ مزا نہیں جو مزا خوش فہمیاں پالنے میں ہے۔ ہر پالتو کو پانے اور پالنے میں جہاں سرمایہ درکار ہوتا ہے وہیں اس منصوبے پر عمدرآمد کے لیے ''جگہ'' دستیاب ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے برعکس ایک ایسا کام جس کے کرنے کے لیے نہ تو کسی سرمائے کی ضرورت ہے نہ ہی جگہ کی وہ صرف اور صرف خوش فہمیاں پالنا ہے۔

کوئی لڑکی مسکرا کر اگر کسی نوجوان کے پاس سے گزر جائے تو اس بیچارے کی یکدم اس سے یک طرف محبت ہو جاتی ہے۔ یہ محبت اگلے کئی دن تک اس کے دل و دماغ پر سوار ہو جاتی ہے اور یوں اس خوش فہمی میں کئی ہفتے اور مہینے گزر جاتے ہیں۔ یہ صرف کسی ایک نوجوان کی بات نہیں پوری قوم بحیثیت مجموعی اس طرح سے اس یک طرفہ محبتوں کا شکار ہو گئی ہے کہ سوشل میڈیا کے پلیٹ فارمز ''شارٹس'' کی صورت میں ان محبتوں سے بھرے پڑے ہیں اور کسی بھی نسوانی آئی ڈی کی حاضری لگانا اور اس پر تبصرہ کرنا ہر نوجوان اپنے لیے فرضِ عین سمجھتا ہے۔ کیا کہا جائے ان خوش فہمیوں کا کہ کئی مرتبہ ان ''بیوٹی کوئینز'' کی آئی ڈی کے پیچھے چھپا ہوا کوئی ''بڈھا کھوسٹ'' نکلتا ہے جس کا انکشاف ہونے کے بعد بندے کا عورت ذات پر سے ایمان ہی اُٹھ جاتا ہے

ہمارے ہاں ملک کے در و دیوار جن پروفیسرز، عامل اور بنگالیوں کی ''وال چاکنگ'' سے بھرے ہوتے تھے اب سوشل میڈیا کے آنے کے بعد یہ کام سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے در و دیوار پر online کی صورت میں منتقل ہو گیا ہے۔ یوں اس ''کمزور مردانہ صفات'' کے حامل معاشرے جس کی آبادی ان کمزور صفات کے ساتھ دنیا بھر میں سب سے زائد شرح پیدائش کی صورت میں 25 کروڑ تک پہنچ چکی ہے۔ یہ نسل ان نیم حکیموں کے توسط سے اسی فکر میں رات دن غلطاں ان کے کاروبار کو بڑھا رہی ہے اور خوش فہمیاں ہیں کہ بڑھتی جا رہی ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ اگر ایسا ہو بھی جائے تو یہ ان ''صفات'' کا کیا کریں گے۔

دنیا میں قیام مملکت اور قوم کی جتنی بھی توجیہات ہیں ان کے تحت کوئی بھی قوم رنگ، نسل، زبان اور جغرافیہ کے ایک ہونے سے معرض وجود میں آتی ہے۔ ہماری یہ قوم جو کبھی ایک قوم تھی ہی نہیں کچھ خوش فہمیوں کے نتیجے میں دنیا کے نقشے پر معرض وجود میں آ تو گئی اس کے بعد خوش فہمیوں کے سلسلے اور دراز ہوتے گئے۔ کبھی امریکی امداد کی خوش فہمی کبھی رشین امداد کی خوش فہمی، کبھی باقی ماندہ اثاثوں کے ملنے کی خوش فہمی، کبھی ایک قوم بننے کی خوش فہمی، اور یوں ساتویں بحری بیڑے کی امداد کی خوش فہمی کا انتظار کرتے کرتے یہ وطن دولخت ہو گیا۔

ایک بار پھر ''فرنٹ سٹیٹ کردار'' کی خوش فہمی لیے پوری قوم اس سوچ میں فکراں اور غلطاں ہے کہ کب ہمیں ہمارے اس کردار کا انعام ملتا ہے اور ہم اسے آئی ایم ایف کے منہ پر مار کر جہان بھر کے قرضوں سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔ ہمارا لیڈر جیل سے باہر آئے گا تو ملک بھر میں دودھ اور شہد کی نہریں چلانا شروع کر دے علیٰ ھذا القیاس............

خوش فہمیوں کے سلسلے اتنے دراز ہیں
ہر اینٹ سوچتی ہے کہ دیوار مجھ سے ہے

ہمارا خاندانی نظام تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ لڑکیاں اور لڑکے اس خوش فہمی کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھتے ہیں کہ لڑکا لڑکی کے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لا کر اس کے قدموں میں نچھاور کرے گا اور لڑکی لڑکے کے والدین کی بیٹی سے زیادہ خدمت کرے گی۔ مگر یہ خوش فہمی ہفتے عشرے میں ہی دور ہو جاتی

ہے اور نوک جھونک سے بات تکرار اور پھر تلوار تک جا پہنچتی ہے۔ یوں اس ایک گھر سے دور گھر بننے کے بعد جب اس جوڑے کی parenting شروع ہوتی ہے تو اس خوش فہمی کے ساتھ دونوں بچے کی پرورش کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارے بڑھاپے میں یہ ہماری کفالت کرے گا۔ اور اگلے ٹھیک 20 سال بعد وہی بچہ اپنی بیوی کو لے کر الگ گھر میں منتقل ہو کر نئی خوش فہمی کا آغاز کر دیتا ہے۔

ملک کا سارا تعلیمی نظام بھی خوش فہمیوں کے ان سلسلوں کو دراز کئے اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ ہر سال ڈاکٹرز، انجینئرز بننے کی دوڑ میں خوش فہمیوں کو لیے ہزاروں والدین اور ان کے نونہال کس شدید ذہنی کرب سے گزرتے ہیں۔ ان میں سے چند سو مراد تک پہنچتے ہیں اور باقی نامراد ہو کر اس ملک کی بیمار نسل بنتے ہیں۔ جو کہیں تو ڈپریشن اور خودکشیوں کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو کچھ ''ڈنکی'' لگا کر ان دیکھا مستقبل سنوارنے بحرالکاہل اور بحراوقیانوس عبور کرتے ہوئے ''رزق خاک'' ہونے کی بجائے ''رزق آبی حیات'' ہو جاتے ہیں۔

ملک کی 25 کروڑ آبادی میں سے نوجوانوں کا تناسب 60% سے زائد ہے۔ کسی بھی ملک کے لئے اتنی بڑی شرح تناسب ترقی کی علامت شمار ہوتی ہے۔ مگر اس کے برعکس ہمارے ہاں خوش فہمیاں پالتی نصف سے زائد حوا کی بیٹیاں آئیڈیل شادی کے تصور میں دہلیز پر اپنے بالوں میں چاندی اتار رہی ہیں اور ان کے سونے جیسے بدن بجائے کندن بننے کے پیتل ہوتے جا رہے ہیں۔ روزگار کے متلاشیان کے لیے یہ وطن اب صحرائے صحارا ہوتا جا رہا ہے جہاں نہ ''آب ہے نہ دانہ'' کب تک ہم اس نوجوان نسل کو مصلحت کا درس دیتے رہیں گے۔

خواب سے حقیقت کا سفر بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے یہ سفر ہم نے بھی طے کرنا ہے خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں سے نکلتے ہوئے حقیقت کی دنیا کا سفر جو ہمیں ہر گزرتے دن کے ساتھ حقیقت کے قریب کر کے نسل نو کو تابناک مستقبل دے سکے۔ اس متروک تعلیمی نظام کی بجائے وہ تعلیمی نظام ان کے پاس آئے جو ان کو مصلحت کوشی سکھانے کی بجائے وہ ہنر دے سکے جس کے بل بوتے پر یہ اپنے مستقبل کی تعمیر کر سکیں۔ وہ خوش فہمیاں جوان کو آگے بڑھنے سے روک رہی ہیں ان کی بجائے اس امید کا سفر جوان کو ان کی منزل تک پہنچا سکے۔

☆☆☆

ذلیل صاحب

بے عزتی اور سردی کے بارے میں مشہور مقولہ ہے کہ یہ جتنی محسوس کی جائے اتنی ہی لگتی ہے۔اس کے برعکس اگر اسے محسوس نہ کیا جائے تو جس طرح بندے کے سر کے اُوپر سے جہاز گزر جاتا ہے اور اسے ذرا سا بھی محسوس نہیں ہوتا ایسے ہی سردی اور بے عزتی کا حال ہے ۔آپ کڑاکے کی سردی میں کسی بھی شادی یا تقریب میں جا کر دیکھ لیں نازک اندام بدن پر نازک سا لباس تھامے دوشیزگان اندر سے تو سردی سے مر جائیں گی مگر مجال ہے جو چہرے مہرے سے سردی کا ذرا سا بھی احساس نمایاں ہونے دیں وجہ صاف ظاہر ہے،

ہمارے ملک میں ایک بڑی شرح آبادی منہ میں سونے کا چمچ لیے بغیر پیدا ہوتی ہے۔بعض حالات میں تو حالت اتنی ناگفتہ بہ ہوتی ہے کہ سونے کی چمچ ایک طرف ''گرائپ واٹراور کولک'' کا چمچ بھی ان کو میسر نہیں ہوتا۔ یہ عموماً آبادی کی وہ خاص شرح سمجھی جاتی ہے جو گھٹی میں میاں بیوی کی نوک جھونک کی صورت میں بے عزتی لیے پیدا ہوتی ہے۔ یوں ان کا ہر گزرتا قدم بچپن اور لڑکپن کی دہلیز پر بے عزتی کے سہارے ہی طے ہوتا ہے۔اب جس طرح ادویات کی کثرت جسم کو immune کر دیتی ہے اور اس پر کسی بھی دوائی کا اثر نہیں ہوتا بالکل ایسے ہی یہ بے عزتی بندے کو اتنا ''ڈھیٹ پروف'' بنا دیتی ہے کہ پھر کوئی بھی بے عزتی بے عزتی لگتی ہی نہیں ہے۔

احساس سے عاری اور ماری اس دنیا میں کسی صاحب احساس کا وجود ''کسی زحمت'' سے کم نہیں ۔ ایسا شخص جہاں اپنے لیے نقصان دہ ہوتا ہے وہیں دوسروں کے لیے بھی اذیت ومصیبت کا باعث جبکہ ڈھیٹ آدمی کے جسم پر جتنا گوشت چڑھتا ہے اتنا کسی حساس کے جسم پر آ ہی نہیں سکتا۔

ہم نے ڈھیٹ کا لفظ تو سنا ہے مگر گدھے سے زیادہ ڈھیٹ ہماری ڈکشنری میں نیا نیا ہے۔ ویسے گدھا اتنا ڈھیٹ کیوں ہوتا ہے جبکہ ہم نے تو اس معصوم جانور میں صبر وقناعت اور شرافت کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔تبھی تو جہاں امریکہ کی ایک مقبول سیاسی جماعت کا انتخابی نشان ''گدھا'' ہے تو ہمارے ملک کی کثیر

گوشت خور آبادی کی محبوب خوراک یہی گدھا ہے۔اب اس کا محبوب اور مرغوب ہونا اس کی شرافت کی وجہ سے ممکن ہے مگر ڈھیٹ ہونے کی بنا پر ممکن دکھائی نہیں دیتا۔

ملک کی اشرافیہ کا چلن بڑا عجیب سا ہے اور ان کی شخصیت کا دوہرا معیار اس سے بھی عجیب تر .... وہ ہر پانچ سال بعد کثیر تعداد میں گدھے ملک میں درآمد کرتے اور بے زبان عوام پر مسلط کرتے ہیں مگر جب بات کھالوں کی آتی ہے تو وہ اپنے ملک میں استعمال کی بجائے ہمسایہ ممالک میں درآمد کر دیتے ہیں جو ری سائیکل ہو کر نئے گدھوں کی شکل میں واپس ہمیں برآمد کر دیے جاتے ہیں۔

جون پور کے قاضی والی کہانی تو آپ نے ضرور سن رکھی ہوگی کہ ایک کمہار کا گزر ایک سکول کے پاس سے ہوا وہاں استاد ایک بچے کو ڈانٹ رہا تھا کہ میں نے بڑے بڑے گدھوں کو انسان بنایا ہے۔کمہار نے یہ سنا تو بہت خوش ہوا اور استاد کو اپنا گدھا پیش کرتے ہوئے درخواست کی کہ مہربانی کر کے اسے بھی انسان بنا دیں۔ ناچار استاد نے اسے رکھ لیا اور کمہار کو ایک سال بعد آنے کو کہا۔سال بعد جب کمہار واپس استاد کے پاس پہنچا اور گدھے کا مطالبہ کیا تو اس نے جان چھڑانے کے لیے اسے کہا کہ میں نے تمھارے گدھے کو پڑھا لکھا کر بڑا انسان بنا دیا ہے اور اب وہ جون پور کا قاضی ہے۔بیچارا کمہار لمبا سفر طے کر کے وہاں پہنچ کر اپنے گدھے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا اور مخصوص اشاروں سے اسے باہر بلانے لگا تو سیکورٹی اہلکاروں نے اسے پکڑ کر باہر نکال دیا۔اس پر وہ کہنے لگا کہ تم بے شک پڑھ لکھ کر یہاں آ بیٹھے ہو مگر آخر ہو تو میرے ہی گدھے............

بات بے عزتی کی ہو رہی تھی اور گدھوں تک جا پہنچی لیکن دراصل بے عزتی اور گدھے میں اب اتنی مناسبت اور مماثلت پیدا کر دی گئی ہے کہ یہ دونوں الفاظ الگ الگ مفہوم ہی نہیں دیتے۔تعلیمی اداروں میں بے عزتی اتنی عام ہے اور اُوپر سے مار پیٹ کے ایوان میں کی گئی قانون سازی بھی اس کے آگے موثر نہیں۔یہی وہ بے عزتی اور گدھا سمجھ کر مار پیٹ ہے جس کے نتیجے میں تیار ہو کر آنے والی نئی نسل جہاں اپنے اوپر بوجھ ہے وہیں معاشرے پر بھی............

بے عزتی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا مزا تب آتا ہے جب دوسرے کی ہو رہی ہو اور اس کی سب سے زیادہ تکلیف تب ہوتی ہے جب کسی دوسرے کے سامنے آپ کی ہو رہی ہو۔جس طرح چھوٹے

ہوتے ہوئے کلاس میں ہم ''پاس'' اور ''چیک'' کھیلتے تھے کہ کوئی بھی کسی ایک طرف سے آنے والی کوئی بات یا تھپڑ ہم آگے منتقل کرتے جاتے تھے اس طرح بڑے بڑے کارپوریٹ اداروں تک صورت حال یہ ہے کہ جو'' بےعزتی'' اوپر کی سطح سے کسی ایک کی ہوتی ہے وہ سفر کرتے ہوئے سب سے نچلی سطح تک جاتی ہے مجال ہے جو اس میں ذرا بھی کمی ہو۔

کہتے ہیں کہ مشہور سندھی ادیب امر جلیل صاحب نے اسلام آباد میں ایک بنگالی باورچی رکھا۔ وہ بندہ کھانا بہت زبردست بناتا لیکن اس کی زبان کا ذائقہ ہی کچھ الگ تھا۔ جب بھی مہمان آتے، وہ نہایت عزت سے پوچھتا: ''ذلیل صاحب! چائے لاؤں؟

مہمانوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور جلیل صاحب کے ماتھے پر پسینہ۔۔

جلیل صاحب نے نرمی سے کئی بار سمجھایا بیٹا میں جلیل ہوں ذلیل نہیں!

لیکن بندہ پورے اعتماد سے ہر بار وہی ذلیل صاحب کچھ اور تو نہیں چاہیے؟

جلیل صاحب تنگ آ گئے، آخر کسی بنگالی دوست نے مشورہ دیا کہ: مسئلہ یہ ہے کہ ہم بنگالی لوگ ج کو ذ اور ذ کو ج بولتے ہیں۔ آپ اپنا نام ذلیل لکھ کر دے دیں وہ خود جلیل کہنا سیکھ جائے گا۔ امید کی کرن چمکی۔ فوراً کاغذ پر ذلیل لکھا اور اس کو تھما دیا۔ اب تو کمال ہو گیا،

جب بھی باورچی بلاتا، بولتا: جلیل صاحب چائے لاؤں؟ لہجہ کچھ ایسا طنزیہ سا ہوتا جیسے دل میں ہنسی دبا رہا ہو۔

اب جلیل صاحب کی مشکل دگنی ہو گئی کیونکہ

: پہلے وہ مجھے ذلیل کہتا تھا لیکن جلیل سمجھتا تھا اور اب وہ مجھے جلیل کہتا ہے لیکن سمجھتا ذلیل ہے۔''

ہمارے ہاں شادی شدہ زندگی کی شروعات بھی کچھ ایسی ہی ہیں، یہ آغاز میں کتنی ہی دلفریب اور خوش کن کیوں نہ ہوں عموماً شادی کے چند ماہ بعد یہ خوش کن رشتہ اور اس کے احساسات ایک ناخوشگوار بلکہ بعض اوقات انتہائی ناگوار احساس کی صورت میں کچھ ایسے اجاگر ہوتے ہیں کہ ڈاکٹر کے نسخے کی طرح صبح، دوپہر، شام بےعزتی نہ ہو تو دن ہی پورا نہیں ہوتا۔ اس بےعزتی میں کچھ کمال سسرال والوں کا ہوتا ہے تو کچھ میاں

بیوی کا...... تبھی تو کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں سارے شادی شدہ مرد وزن کو اگر دوبارہ جنم اور شادی کا اختیار دیا جائے تو چند ایک کو چھوڑ کر وہ کبھی بھی اپنے موجودہ شریک حیات کو نہیں چنیں گے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ بے عزتی جتنی بھی حسین و دل فگار ہو اس کے ساتھ نبھا نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆

ماں کی دعا جنت کی ہوا

وطن عزیز میں اس قول کا جتنا استعمال کیا جاتا ہے اتنا شاید ہی کوئی اور جملہ ہوگا جو وطن عزیز کی ہر دیوار ودر پر چسپاں دکھائی دے گا۔ سڑک پر چلتے ہوئے ہر پرانے ماڈل کی گاڑی پر آپ کو یہ جملہ پڑھنے کو ملے گا۔ کوئی ریڑی کوئی ڈھابہ کوئی ٹک شاپ ماں کی دعا جنت کی ہوا کی عملی تفسیر پیش کر رہی ہوتی ہے۔ بادی النظر میں اگر دیکھا جائے تو ہمارا ملک اپنے قیام سے لے کر آج تک جس طرح اور جس حساب سے چل رہا ہے وہ یقیناً ماں کی دعا سے ہی چل رہا ہے ورنہ تو اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی کے مصداق آپ کو اس وطن کی کوئی ایک کل بھی سیدھی دکھائی نہیں دے گی۔ فرد سے لے کر قوم تک اور گھر سے ملک کے بڑے بڑے اداروں تک کوئی ایک جگہ بھی آپ کو ایسی دکھائی نہیں دے گی جو کسی خاص نظم کے تابع ہو۔ گویا یہ وہ پرانی موٹر ہے جو چلی جا رہی ہے خدا کے سہارے۔

ماں کی دعا جنت کی ہوا کا سب سے زیادہ استعمال ہمارے ہاں شعبہ ٹرانسپورٹ والوں نے کیا ہے وہ بھی پرانے ماڈل کی گاڑیوں پر۔ کوئی بھی پرانے کسی ماڈل کی کوئی کار، بس یا رکشہ لے لیں آپ کو جلی الفاظ میں ماں کی دعا جنت کی ہوا لکھا ہوا نظر آئے گا۔ اس کے برعکس جب نئے ماڈل کی کسی بہت مہنگی گاڑی پر نظر پڑتی ہے تو اس پر ایسی کسی عبارت کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ نئے ماڈل کی مہنگی گاڑیاں باپ کے پیسوں سے آتی ہیں ان کے لیے ماں کی دعا جنت کی ہوا کی ضرورت نہیں پڑتی جبکہ پرانے ماڈل کی وہ گاڑیاں جن میں سے بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو پچھلی صدی کے پرزہ جات کے ساتھ اب بھی سڑکوں پر رواں دواں ہیں وہ بھلا ماں کی دعا کے بغیر کیسے چل سکتی ہیں۔

ماں کی دعا کے بارے میں ایک اور بات کہی جاتی ہے کہ جب کسی غریب کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کے لیے دعا کرتی ہے کہ میرا لعل بس زندہ رہے...... بے شک مانگ کر ہی کھائے۔ سو وہ بیچارہ اس دعا کے زیر اثر زندگی بھر محتاجی کی زندگی گزارتا ہے اور مانگ تانگ کر گزارا کرتا ہے۔ ایسے میں اگر زندہ رہنے کے

لیے کوئی پرانی ٹیکسی یا رکشہ خرید لے تو لازماً اسے اس پر ماں کی دعا لکھوانا پڑتا ہے۔اس کے برعکس جب کسی امیر آدمی کے ہاں بچے کی پیدائش ہوتی ہے تو اسے یہ دعا مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی کیوں کہ وہ اسے خود امور جہاں بانی سکھاتا ہے اور اس قابل کرتا ہے کہ وہ سر اُٹھا کر جی سکے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ غربت بذات خود ایک بڑی آزمائش ہے۔تبھی تو اس سے پناہ مانگی گئی ہے اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ غربت کبھی کبھی انسان کو کفر تک لے جاتی ہے۔

ملک میں مہنگائی کے اعداد وشمار پر جب نظر پڑتی ہے اور صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے تو یہ اعداد و شمار اتنے خوف ناک ہیں کہ ملک کی نصف سے زائد آبادی خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور یہ اعداد وشمار بتدریج آسمان کی جانب بلند ہو رہے ہیں۔بلند ہونے والے دوسرے اعداد وشمار بیچارے غریبوں کے بچوں کی صورت میں ہیں جو ملک میں گرمی اور سیاسی درجہ حرارت کی طرح بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ اندرون پنجاب ،سندھ، کے پی کے اور بلوچستان کی صورت حال تو اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ جہاں بیچاری جنتا کو جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے بھی سخت مشقت سے گزرنا پڑتا ہے۔ایسے میں صرف ماں کی دعا ہی اس بیچاری جنتا کے پاس واحد سہارا ہے جس کے ذریعے وہ تمام تر مشکل حالات کا مقابلہ کرتی ہے۔

اگر اداروں کی بات کی جائے تو ان کے اعداد وشمار اور بھی زیادہ خوفناک ہیں۔ ہر آنے والی حکومت نے اپنے کارکنوں کو کھپانے کے لیے جی بھر کر اداروں میں بھرتیاں کیں جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان میں سب سے زیادہ پیداوار اور ریونیو دینے والے ادارے بھی خسارے کا شکار ہو کر آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ پاکستان سٹیل، پی آئی اے، پاکستان ریلوے، پاکستان ڈاک اور وہ سب قومی ادارے جو ایک وقت میں پاکستان کا روشن چہرہ تھے آج نجکاری اور جانے کن کن مسائل کا شکار ہیں۔فلائیٹس کے بین الاقوامی قاعدے کے مطابق کسی بھی ائیر لائن کے لیے بھرتی کرتے وقت ایک جہاز کے برخلاف ۱۲۰ افراد کو بھرتی کیا جاتا ہے۔ یہی تعداد ہمارے ملک میں پاکستان کی سب سے بڑی ائیر لائن کے لیے بھرتی میں ۷۰۰ کے لگ بھگ بنتی ہے ۔اب اس ڈوبتی نیّا کو بچانے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کے پی آئی اے کے ہر جہاز پر موٹے الفاظ میں ماں کی دعا جنت کی ہوا لکھوا دیا جائے۔

ویسے بھی جس طرح کی ان بیچارے جہازوں کی حالت زار ہے اس میں مسافروں کو مفت میں جنت کی ہوا کے مزے مل جاتے ہیں۔ ہمارا مشورہ ہے کہ حکومت وقت فوراً اقدامات کرے اور پاکستان میں ان تمام ادارہ جات کو جو اپنی آخری سانسیں گن رہے ہیں ان پر ماں کی دعا جنت کی ہوا لکھوایا جائے۔اس سے امید کامل ہے کہ ان اداروں کے زوال کا تیزی سے بڑھتا ہوا سلسلہ رک سکتا ہے اور ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔رہی بات ان اداروں میں کام کرنے والی افرادی قوت کی تو ان کا حال بھی اداروں کی حالت زار سے کچھ کم نہیں۔پوری دنیا میں الیکشن کے بعد جیت کر آنے والے وزراء کو مختلف وزارتوں کا قلم دان سونپا جاتا ہے اور وہ وزراان اداروں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے شب و روز ایک کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں وزیر اس لیے بنایا جاتا ہے کہ وہ آ کر اپنی متعلقہ وزارت میں اپنے کارکن بھرتی کر سکے۔اس لیے ہر وزیر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس معاملہ میں اپنے پیش روؤں پر بازی لے۔

اللہ کی ذات پر ہماری قوم کے یقین کا یہ عالم ہے کہ ساری زندگی حرام خوری میں گزارتے ہیں، دھیلے کا کام نہیں کرتے مگر ٹھیک دفتری اوقات میں نماز کا ایک گھنٹے کا وقفہ لازمی کریں گے۔اس ساری ریاضت کے بعد ریٹائر ہو کر سب سے پہلے عمرہ کی ادائیگی کے لیے رخ کرتے ہیں اور ساری عمر کی حرام خوری کو صرف ایک عمرہ میں معاف کروا کر نئے سرے سے باقی ماندہ زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ایک عمرہ میں ساری زندگی کی حرام خوریاں بھی معاف اور ماں کی دعا کے ساتھ ساتھ جنت کی ہوا کا بھی مفت میں مزا۔

رہی پاکستان کی ایلیٹ کلاس تو اس کا تعلق چاہے بیوروکریسی سے ہو چاہے اسٹیبلشمنٹ سے ان کی تو ہر کل ہی نرالی ہوتی ہے۔ یہ پاکستان کا وہ اعلیٰ طبقہ ہے جن کا بچپن اور لڑکپن یورپ میں گزرتا ہے، جوانی پاکستان کی بیوروکریسی اور اسٹیبلشمنٹ کی خدمت کرتے اور بڑھاپا واپس یورپ میں جزیرے خرید کر اور مختلف ساحلوں اور سیر گاہوں کی یاترا کرتے اور آخر کار تابوت واپس وطن کی مٹی کے سپرد ہوتا ہے یوں ماں کی دعا بالآخر جنت کی ہوا کی شکل میں ''وطن کی خاک سپرد خاک'' ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

صاف اور صحت مند معاشرہ

ایک انٹرنیشنل این جی او میں جاب کے دوران میں نے اپنے فرانسیسی ہم منصب سے پوچھا یہاں رہتے ہوئے پاکستان اور فرانس میں کیا فرق محسوس کیا ہے؟ تو اس کا جواب تھا آپ پورے فرانس میں گھوم کر دیکھ لیں کہیں کوئی گندگی نظر نہیں آئے گی جبکہ آپ کا ملک اس معاملے میں خود کفیل ہے یہ اس جگہ بھی گندگی پھینکتے ہیں جہاں گندگی پھینکی جاسکتی ہے اور اس جگہ بھی جہاں جلی الفاظ میں ''گندگی پھینکنا منع ہے'' لکھا ہوا ہوتا ہے۔ایک دفعہ آفس ٹور پر سب آفس ورکر ساتھ گئے تو پکنک پوائنٹ پر ہر ایک کھانے پینے کے بعد کچرا ادھر ہی چھوڑ کر اُٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ انگریز تنہا سب کچرا اکٹھا کر رہا ہے اور واپس اپنے شاپر میں ڈال رہا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو تو کہنے لگا کہ یہ پکنک پوائنٹ ہم سب کی مشترکہ امانت ہے اسے گندہ کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں اور ہمارے ملک میں ہر آدمی انفرادی طور پر صفائی قائم رکھنے کا ذمہ دار ہے۔

اس کے برعکس جب وطن عزیز میں اپنے اطراف میں دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ہم میں سے ہر ایک اس حد تک ذمہ دار ہے کہ وہ اپنا گھر کا کوڑا کرکٹ اپنی کھڑکی، اپنے دروازہ یا اپنی گاڑی سے باہر سڑک پر پھینکنے کے بعد اپنے فرائض سے سبکدوش ہوجاتا ہے اس کے بعد صفائی کی ذمہ داری متعلقہ محکمہ کی ہوگی یا کسی اور ویلفیئر ادارے کی۔ بڑے شہروں میں کوڑا کرکٹ کے مسائل سے لے کر گلی محلے اور چھوٹے چھوٹ قصبات تک سب اس لت میں پڑے ہیں.

ایک بڑے اسکول کے چھوٹے سے بچے کو جب میں نے کلاس سے باہر ریپر پھینکتے دیکھا تو اسے کہا کہ "بیٹا اس کو اٹھائیں اور فرش پر پھینکنے کی بجائے ڈسٹ بن میں ڈالیں تو اس بچے نے جھٹ سے جواب دیا کہ "انکل! میں کوئی سوئیپر تھوڑی ہوں .. تھوڑی دیر میں سوئیپر انکل آکر اٹھالیں گے۔"

یہ اس بچے کا جواب نہیں تھا یہ اس اسکول کا جواب تھا جہاں سے وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

ہمارے ہاں اگر عوام الناس کے مجموعی طرز عمل کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہم میں

سے ہر ایک گفتار کا غازی ہے کردار کی بات آتی ہے تو ہم میں سے ہر ایک آئیں بائیں شائیں کرنے لگتا ہے۔ آپ نے کئی لوگوں کو بغیر ہیلمٹ اور بغیر سیٹ بیلٹ باندھے پاکستان کے ٹریفک کے نظام کو گالیاں دیتے دیکھا ہوگا۔ آپ نے کئی لوگوں کو فٹ پاتھ پر پان کی پیک مارتے، اپنی گلی کے سامنے والی گلی میں کچرا ڈالتے، سگریٹ پی کر زمین پر ڈالتے اور پھر دبئی اور لندن کی صفائی ستھرائی کا ذکر کرتے یقیناً دیکھا ہوگا۔ اپنے مکان کی تعمیر کے دوران اچھے خاصے درخت کو کاٹتے اور اور پھر سنگاپور کی ہریالی کا ذکر کرتے سنا ہوگا۔ آپ نے کئی لوگوں کو اپنے گھر کی گیلری بڑھاتے اور گلی گھیرتے دیکھا ہوگا اور ان ہی کی زبان سے امریکا اور یورپ کی چوڑی کشادہ گلیوں اور سڑکوں کا ذکر سنا ہوگا۔ یہ سب کیا ہے یہ ہمارے کردار کی وہ جھلک ہے جو نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔

کہتے ہیں کہ شمالی کوریا میں ایک بار یونیورسٹی کے طلبہ نے صفائی کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے ہفتہ صفائی منایا اور بڑے بڑے شہروں میں خود کوڑا کرکٹ تلف کر کے اور صفائی کر کے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس طرح اپنے آس پاس کے ماحول کو صاف رکھیں۔ اس ہفتہ صفائی کے مزید ایک ہفتہ بعد دوبارہ صورتحال جاننے کے لیے کہ اس آگاہی مہم کا نتیجہ کیا نکلا ہے جب وہاں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر لگے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب وہ وہاں پہنچے تو لوگوں نے انہیں پکڑ کر زدوکوب کیا کہ ایک ہفتہ سے آپ لوگ کہاں تھے صفائی کے لیے نہیں آئے آپ کی وجہ سے گندگی کے ڈھیر لگ گئے ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال ہمارا بھی ہے معاملہ چاہے صفائی کا ہو یا دیگر کسی شعبہ ہائے زندگی کا ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو اس کا ذمہ دار قرار دیکر خود اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں سال میں کتنی بار اور کون کون سے ادارے ہیں جو ہفتہ صفائی نہیں مناتے ۔ ہماری حکومتیں اس کام کے لیے باقاعدہ طور پر بجٹ مختص کرتی ہیں، تعلیمی اداروں اور دیگر انتظامی اداروں کے تعاون سے باقاعدہ طور پر مہم چلائی جاتی ہے۔ اخبارات اور میڈیا کے دیگر ذرائع کو بروئے کار لا کر لوگوں میں صفائی کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہفتہ صفائی کے ذریعے پورے سال کا جمع شدہ گند اکٹھا کر کے تلف کیا جاتا ہے۔ سال میں ایک بار ہمارے حکمران اور آفیسران خود ہاتھ میں جھاڑو پکڑ کر صفائی کی اہمیت پر روشنی

ڈالتے نظر آتے ہیں۔اس ساری مشقت کے باوجود جب ہم ان کے نتائج دیکھتے ہیں تو وہ انتہائی ہوش ربا ہوتے ہیں۔وجہ صاف ظاہر ہے کہ جب قوم کے افراد کے اندر اجتماعی طور پر صفائی اور پاکیزگی کا احساس اجاگر نہیں ہوگا تو ہفتہ صفائی یا میڈیا کے ذریعے صفائی کی اہمیت اجاگر کرنے سے افرادِ قوم کبھی بھی اس فریضہ کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوسکتے۔

ایک ایسا ملک جو اسلام کے نام پر بنا اور جس دین کا نکتہ آغاز ہی صفائی اور پاکیزگی ہے اس کے ماننے والوں کا اس طرح کا رویہ سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔گھر کی ابتدائی تربیت سے لے کر تعلیمی اداروں میں ابتدا سے ہی صاف اور صحت مند معاشرے کے قیام کے لیے عملی تربیت سے اس کام کا آغاز وہ واحد طریقہ ہے جو افرادِ قوم کے اندر اس احساس کو اجاگر کرسکتا ہے۔اگر ہم میں سے ہر ایک صرف اپنے حصے گندگی پھیلانا ترک کردے اور اسے باقاعدہ طور پر تلف کرے تو ہماری گلیاں، ہمارے شہر، ہمارا آس پاس ہماری نسلوں کے لیے محفوظ ہوسکتا ہے۔یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ صحت مند جسم اور صحت مند معاشرہ صحت مند ماحول سے ہی جنم لے سکتا ہے۔

☆☆☆

ہائے یہ سوشل میڈیا

سوشل میڈیا بالخصوص فیس بک دور حاضر میں رابطے کا اہم اور موثر ذریعہ ہے۔اس کے بہت سے فائدے ہیں اور سوشل میڈیا نے صحیح معنوں میں دنیا کو گلوبل ویلج بنا کر اسے ایک کنبے کی شکل دی ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے مگر میرا ایک دوست کہتا ہے کہ اس نے انسانی زندگی کو پہلے سے زیادہ مشکل بنا دیا ہے اور نسل نو کو ایک ایسی الجھن میں ڈال دیا ہے کہ " نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن ."میرا دوست کہتا ہے کہ میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو اچھے بھلے کسی نہ کسی روزگار سے وابستہ تھے مگر سیلفی کے شوق کی وجہ سے انہیں وہ ملازمت یا کاروبار چھوڑنا پڑ گیا کیونکہ روزگار کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ بندے کو قیدِ مقام سے گزرنے نہیں دیتا جبکہ تازہ سیلفی کے لیے آپ کو ہر روز نئی لوکیشن چاہیے تبھی زیادہ لائکس اور کمنٹس ملیں گے۔

لہذا مجبوراً یہ بیچارے طارق بن زیاد کی طرح اپنی کشتیاں جلا کر ان دیکھی دنیا کا سفر شروع کرتے ہیں۔اب ذرا ان کا سٹیٹس ملاحظہ کریں تو پتہ چلے گا کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک شہر سے دوسرے شہر جہاں آپ کو تازہ سیلفی ملے گی وہیں اس شہر کی لوکیشن بھی آپ کے موبائل پر ان کے سٹیٹس کے ساتھ ملتی جائے گی۔اس معاملہ میں کچھ سیلفی کنگ اس حد تک مہم جو واقع ہوئے ہیں کہ ہر مہینے وزٹ ویزے پر جہاں اپنے سامان کے ساتھ دیارِ غیر میں اپنے نخرے خود اٹھاتے ہیں وہیں سیلفی کا بوجھ الگ سے سر پر سوار رہتا ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ جس کے پاس یہ سب کچھ کرنے گئے ہوتے ہیں اگلے مہینے اس نے بھی تو سیلفی مہم پر واپس ان کے پاس آنا ہوتا ہے وہ بوجھ الگ سے ان ناتواں کندھوں پر اٹھانا پڑتا ہے۔ذرا خود سوچیے مہنگائی کے اس دور میں دیس دیس کی خاک چھاننا اور بار بار عمرے کر کے سیلفیاں بنانا کوئی آسان کام ہے۔ اس ناگفتہ بہ صورت حال پر ایک دل جلا تو یوں پکار اٹھا

"سیلفی کے اس شوق نے کیا کیا کِیا ذلیل
میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا"

بات صرف سفر کی نہیں ہر نئی سیلفی کے لیے نیا لباس بنوانا اوکھلی میں سر دینے کے مترادف ہے کیونکہ ایک ہی ڈریس میں بہت سی سیلفیاں بن گئیں تو لوگ کیا کہیں گے۔امیر طبقہ تو یہ سب کرسکتا ہے غریب اور متوسط طبقے کے لیے یہ سب کسی بھی طرح ممکن نہیں۔

ایک اور المیہ جس کا سامنا بیچارے فیس بک استعمال کرنے والوں کو کرنا پڑتا ہے وہ ہے اپنا سٹیٹس بار بار اپ ڈیٹ کرنا۔ جس طرح دن رات کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں بعینہ فیس بک کے بھی اتنے ہی سٹیٹس رکھے گئے ہیں۔اب ذرا ہمیں کوئی یہ بتائے کہ ایک ہی وقت میں بندہ خوش اور اداس کیسے ہوسکتا ہے۔مگر برا ہو اس فیس بک کا کہ چار و ناچار آپ کو ہر گزرتے لمحے اپنا سٹیٹس Feeling Happy سے Feeling Sadاور پھر ہر گھنٹے کے حساب سے Crazy, naughtyاور جانے کیا کیا کرنا پڑتا ہے اور اسی مناسبت سے سیلفی لینا گویا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے ۔

اس کمبخت فیس بک نے خواتین کی زندگی پر بھی دور رس اثرات مرتب کئے ہیں لہذا ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خوائش پہ دم نکلے کے مصداق سیلفی بنانے کے بعد اپ لوڈ کرتے ہوئے انہیں کس تکلیف دہ عمل سے گزرنا پڑتا ہے کوئی ان کے دل سے پوچھے۔ اس لیے کہ ہر بار نہ چاہتے ہوئے کبھی صرف آنکھیں کبھی ہیر سٹائل،کبھی مہندی والے ہاتھ یا پاؤں تو کبھی ادھ کھلی پنڈلیاں قسطوں میں خودکشی نہیں تو اور کیا ہے جو ایک طرف دیکھنے والے کرتے ہیں تو دوسری طرف اپنا سب کچھ دکھانے کی خواہش لیے ان معصوموں کو کرنا پڑتی ہے اور جو بے چاری یہ نہیں کرسکتی وہ کسی ماڈل کی تصویر اپ لوڈ کرتی ہے بلکہ ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ جو جتنے پرانے ماڈل کی ہوتی ہے وہ اتنے ہی نئے ماڈل کی تصویر اپ لوڈ کرے گی۔کتنے جبر سے یہ سب اسے کرنا پڑتا ہوگا،کون کون سے فلٹر تصویر پر لگانا پڑتے ہوں گے۔ہماری تو اس سوچ سے بھی روح کانپ جاتی ہے کیونکہ ہم نے سیانوں سے سنا ہے کہ ایک کمبل میں دو فقیر اور ایک سلطنت میں دو بادشاہ رہ سکتے ہیں مگر دو عورتیں ایک دوسری کو برداشت کرجائیں وہ بھی ناز و ادا میں ممکن نہیں۔

اس کمبخت سوشل میڈیا کی جو چیز ہمیں سب سے بری لگتی ہے وہ ہے پنجرہ کھول کر بار بار مرغی کے نیچے دیکھنا کہ اس نے انڈہ دیا ہے یا نہیں یا کسی عورت کا بار بار اپنے بچے کا ڈائپر چیک کرنے کی طرح بار بار

اپنے سوشل میڈیا اکاونٹ کو چیک کرنا کہ کسی نے کوئی لائک یا کمنٹ کیا ہے ۔اسی طرح اگر کسی نے کوئی نئی پوسٹ شیئر کی ہوتو اسے ایک دم کاپی کر کے اپنے نام کے ساتھ پیسٹ کر کے فیس بکی دانش ور کہلوانے کے لئے لمبا انتظار کرنا......

فیس بکی دنیا کے دکھ بیان کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ ہے مگر کیا کریں وقت کے دامن میں اتنی گنجائش کہاں مجھے کچھ لکھنے اور آپ کو پڑھنے کی کیونکہ ابھی میں نے اور آپ نے نئی سیلفی بھی تو بنانی ہے اور سٹیٹس اپ ڈیٹ بھی تو کرنا ہے۔

☆☆☆

جوڑوں کا درد

بہت پہلے ایک جملہ نظر سے گزرا تھا "جوڑوں کا درد کیا ہے یہ جوڑے ہی بہتر جانتے ہیں' اس ایک جملے کے کئی پہلو اور معنی ہو سکتے ہیں مگر امتحانات کے نتائج کے بعد نئے تعلیمی سال کے آغاز پر اگر غور کیا جائے تو اس کا اطلاق ان شادی شدہ جوڑوں پر ہوتا ہے جن کی شادی کو دس سال سے زیادہ گزر چکے ہیں اور وہ کثیر الاولاد بھی ہیں۔ایک طرف بچوں کے نتائج پر وہ شاداں ورقصاں ہیں تو دوسری طرف نئی کلاس میں بچوں کے داخلہ اور کتابوں، یونیفارم کی منہ مانگی قیمتیں ان سے جینے کی آس چھین کر ان کے درد میں اضافہ کر رہی ہیں۔ غریب تو شاید دست سوال بلند کر لے مگر یہ جوڑے سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے ایسا کرنے سے بھی قاصر ہیں۔

جب سے ملک میں ہر شعبہء زندگی میں فرنچائز بزنس کا سلسلہ شروع ہوا ہے تعلیمی اداروں نے بھی ایلیمنٹری ایجوکیشن سے یونیورسٹیوں کی سطح تک باقاعدہ فرنچائزوں کی شکل اختیار کر لی ہے. لہذا اب کسی بھی ادارے میں " کوالٹی آف ایجوکیشن " کا اندازہ اس ادارے کی عمارت، زرق برق یونیفارم اور فیسوں سے لگایا جانے لگا ہے۔

سکول کالج سے یونیورسٹی کی سطح تک مہنگی فیسیں بٹورنے والے یہ ادارے جہاں ہر سال پڑھے لکھے بیروزگاروں کی تعداد میں دن دگنی رات چگنی کی رفتار سے اضافہ کر رہے ہیں وہاں اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ یہ سب مہنگی تعلیم دلوانے اور قربانی دے لینے کے باوجود ان کے بچوں کا بہتر مستقبل اور روزگار یقینی ہو سکتا ہے گویا جوڑوں کا جو درد جوڑے اپنے بچوں کی پرائمری تعلیم کے دوران محسوس کرنا شروع کرتے ہیں تا عمر جاری رہتا ہے جس کا کوئی علاج اور مداوا حکومت وقت کے پاس ہے نہ ہی سماجی سطح پر اس کے حل کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش ہو رہی ہے۔

''جوڑوں کے درد'' کا نام سنتے ہی اگر چہ توجہ فوراً اس درد کی جانب مبذول ہو جاتی ہے جس کے سائن بورڈ عموماً حکما نے اپنے مطب کے باہر آویزاں کر رکھے ہوتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی

زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب جوڑوں کا درد زندگی کا باقاعدہ حصہ بن کر انسان کی عملی زندگی میں سپیڈ بریکر کا کردار ادا کرنا شروع کرتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو بستر سے لگا دیتا ہے۔ جوڑوں نے بلاشبہ ایک خاص عمر میں اس جوڑوں کے درد کا شکار ہونا ہی ہوتا ہے۔مگر جو درد شادی کے عموماً ابتدائی چند سالوں میں ہی جوڑوں کو شروع ہوتا ہے جس کے تذکروں سے کتابیں بھری ہوئی ہیں۔کہیں کھانا گرم کرنے اور برتن دھونے کا درد، کہیں کپڑے دھونے اور استری کرنے کا درد، کہیں جیب خرچ نہ ملنے کا درد تو کہیں دوسرے کی بیوی یا شوہر کو دیکھ کر اس کے نہ ملنے کا درد کون کون سے درد کا ذکر کیا جائے۔ ہر درد ایسا ہے جو جان لیوا ہے اور ہر درد ایسا ہے جو عمر بھر کا ہے۔

آپ کہیں بھی چلے جائیں، کسی بھی جوڑے سے مل کر دیکھ لیں۔ چند جوڑوں کو چھوڑ کر زیادہ تعداد میں آپ کو وہ جوڑے ملیں گے جن کا حال یہ ہے کہ

پچھلی رفاقتیں بھی تمھاری طلب میں تھیں
تازہ رفاقتوں میں بھی حائل تمہی تو ہو

یہ ایسا درد ہے جو کم وبیش ہر جوڑے کو درپیش رہتا ہے۔سوشل میڈیا کی یلغار اور گلیمر کی بھرمار نے تو جوڑوں کے اس تعلق کو اور کمزور کر دیا ہے۔جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہر جوڑا ایسی خواہش لا حاصل کے پیچھے بھاگ رہا ہے جس کی وجہ سے حاصل کا لطف بھی جاتا رہا ہے۔اپنا مشاہدہ یہ رہا ہے کہ جوڑوں کی عموماً ساری زندگی ایسے نامعلوم آئیڈیل کی تلاش اور پھر ایک دوسرے کو ''زیر'' اور ''تابع'' کرنے میں گزر جاتی ہے جس کا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ساری توانائیاں جب اس ایک کام میں صرف کی جائیں گی تو جوڑوں کا درد ہونا تو فطری ہوگا۔ ہمارے ہاں جتنے لطائف جوڑوں سے متعلق مارکیٹ میں گردش کرتے نظر آتے ہیں اتنے شاید ہی کسی اور رشتے سے متعلق تخلیق ہوتے ہوں گے۔

ان دردوں سے لڑتے لڑتے جب جوڑے پندرہ بیس سال گزار لیتے ہیں تو پھر بچوں کی تعلیم و روزگار اور ان کی آبادکاری کا درد نئے سرے سے سر اُٹھاتا نظر آتا ہے۔پچھلے دردوں سے لڑتے لڑتے جوڑوں میں اگرچہ بہت سی قوت مدافعت آچکی ہوتی ہے مگر یہ تازہ درد تو پرانے تمام دردوں سے ماسوا دکھائی دیتا ہے۔

اس لیے کہ اس درد سے نجات کے لیے تو ابا جی کی عمر بھر کی کمائی، ان کی پنشن بھی کم پڑتی نظر آتی ہے۔ کسی ایک دو بیٹے بیٹیوں کے ہاتھ پیلے ہوتے ہیں کہ پنشن کی ساری رقم ختم ہوجاتی ہے۔ اب نوبت بنکوں کے قرضوں اور ایڈوانس تنخواہوں تک آن پہنچتی ہے۔ اب جو تنخواہ یا پنشن سے ماہوار سطح پر کٹوتی شروع ہوتی ہے تو یہ درد پہلے دردوں سے بھی زیادہ محسوس ہونے لگتا ہے۔

اس ساری صورت حال سے لڑتے لڑتے حال یہ ہونے لگتا ہے کہ آنکھوں پر موٹا سا چشمہ لگ جاتا ہے۔ جسم اضافی مٹھاس بنانا یا کم کرنا شروع ہوجاتا ہے، تو ند جوڑوں سے آگے نکل جاتی ہے۔ موٹاپا رہی سہی کسر نکالنا شروع کرتا ہے، یوں کبھی سانس پھولتی ہے تو کبھی بلند فشار خون تو کبھی رگوں میں بڑھتی ہوئی مٹھاس کا عارضہ دردوں میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اور اضافے کا باعث بننے لگتا ہے۔ کثرت استعمال سے دل اپنی رفتار بھولنے لگتا ہے اوپر سے اب شروع ہونے والا جوڑوں کا درد پہلے سارے دردوں سے زیادہ سخت معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس لیے بھی کہ پہلے سارے درد ہونے کے باوجود جوڑے چلنے پھرنے کے قابل رہتے تھے مگر اس جوڑوں کے درد کی وجہ سے تو جوڑ جوڑ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

یوں زندگی ایک ایسے کنارے پر لا کر چھوڑتی ہے جہاں جوڑے مکمل طور پر بے بس ہونے لگتے ہیں۔ اوپر سے گھر میں بسائے ہوئے نئے جوڑوں کی نظر میں ان پرانے جوڑوں کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے وہ کوشش کر کے ان پرانے جوڑوں کو کسی اضافی کمرے میں منتقل کر کے اپنی زندگی کی گھما گھمیوں میں مصروف ہوجاتے ہیں یا پھر انہیں کسی اولڈ ہوم کی زینت بنا کر اپنی دنیا میں لوٹ جاتے ہیں۔

تب جوڑے پیچھے مڑ کر ماضی پر نگاہ دوڑاتے ہیں جہاں سے جوڑوں نے عملی زندگی کا آغاز کیا تھا اور ہنسی خوشی وقت گزر رہا تھا تو احساس ہوتا ہے کہ اصل وقت تو وہی تھا جو ان جوڑوں نے ایک دوسرے کو کھوتے اور بے وقعت کرتے گزارا۔ جہاں آتش عشق اپنے پورے جوبن پر تھی اور جہاں ہر خوشی کو محسوس کرنے کا احساس کئی گنا زیادہ تھا۔ اب تو حال یہ ہے کہ کوئی خوشی خوشی نہیں لگتی، کوئی احساس احساس نہیں لگتا اس لیے کہ یہ سب محسوس کرنے والا وہ جذبہ وہ دل تو کہیں ماضی کے دھندلکوں کی نظر ہوگیا اور یوں ''جوڑوں کا درد'' جوڑوں کے درد میں بدل کر جوڑوں کو بے جوڑ کر جاتا ہے۔

شحن یا جگالی

جگالی یا Cud وہ عمل ہے جو ہم عموماً جانوروں کو کرتا دیکھتے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے جس کے ذریعے جانور اپنی خوراک اپنے منہ میں لا کر چباتے اور جھاگ بناتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا معدہ کثیر جہتی Multy Stages ہوتا ہے اور ان کا کھانا مرحلہ وار ہضم ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی ہے کہ سارے ہی جانور جگالی نہیں کرتے بلکہ مخصوص جانور جیسے گائے، بھینس، بکری، ہرن اور اونٹ عموماً جگالی کرتے ہیں۔ جگالی جانور کی صحت کی علامت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جانور کو ڈاکٹر کو دکھایا جاتا ہے تو ڈاکٹر سب سے پہلے یہی سوال کرتا ہے کہ کیا بیمار جانور "جگالی" کرتا ہے؟ اگر جگالی نہ کرے تو جانور بیمار سمجھا جاتا ہے۔اس کے برعکس انسان کے دانت چونکہ اوپر نیچے کے ہوتے ہیں اور معدہ بھی ایک ہی ہوتا ہے لہذا انسان اگر جگالی کرے تو یہ اس کے بیمار ہونے کی علامت ہے۔ اسلام نے آدمی کو بار بار جگالی کرنے سے منع فرمایا ہے اور جگالی کرنے کے نقصانات بیان کیے ہیں۔

قطع نظر اس بحث کے موجودہ دور میں انسان نفسیاتی جگالی کرتا دکھائی دیتا ہے۔یعنی وہ دوسروں کی طرف سے کی گئی ساری زیادتیاں اپنی یاداشت کی ہارڈ ڈسک پہ محفوظ رکھتا ہے اور انہیں بار بار ریفریش کرتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں وہ زیادتیاں بھی ہوتی ہیں جنہیں وہ بظاہر حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر اپنے تئیں معاف کر چکا ہوتا ہے۔ وہ اپنی سوچوں کے اس Recycle bin کو کبھی خالی نہیں کرتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی سوچوں اور دماغ سے کبھی وہ بات نہیں نکلتی اور وہ انہی سوچوں میں غلطاں خود کلامی اور جگالی میں مبتلا رہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا گیا ہے اور آزمائشوں میں سب سے پہلی اور سخت آزمائش اور امتحان عموماً اس کے رشتہ دار ہوتے ہیں یا وہ جو گھر میں پیدا ہوتے ہیں۔ الاقرب فالاقرب کے اصول کے تحت عموماً جو جتنا قریبی ہوتا ہے وہ اُتنا ہی سخت ڈنگ مارتا ہے۔ اسی طرح ایک عربی قول "الاقارِبُ کالعقارب" کے مصداق رشتہ دار بچھوؤں کی مانند ہوتے ہیں۔ ایسے رشتہ داروں کے ڈنگ کے

زہر کو رگوں میں لیے پھرنا ایک نقصان دہ عمل ہے۔اس لیے پہلی فرصت میں ہی اسے نکال باہر کرنا چاہیے۔اس سے دنیاوی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے اور آخرت کی منزل بھی آسان ہو جاتی ہے اور بوقتِ موت جان بھی آسانی سے نکلتی ہے۔ہارڈ ڈسک پر جتنا ڈیٹا کم ہوتا ہے تو شٹ ڈاؤن اتنا ہی جلدی ہو جاتا ہے ورنہ فرشتوں کو پروگرام بند کرتے کرتے کافی دن لگ جاتے ہیں اور جان کنی کا یہ عالم ختم ہوتے ہوتے ختم ہوتا ہے۔

زیادتیاں معاف نہ کرنے کا بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کے اندر ہر وقت ایک ایسی " گھوں گھوں گھوں" رہتی ہے جو ابتدا میں محض ایک نفسیاتی کیفیت تک محدود ہوتی ہے مگر آگے چل کر طرح طرح کے جسمانی عوارض کا باعث بنتی ہے۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب اللہ کی خاطر کسی کو معاف کر دیا جائے تو پھر کم از کم اللہ سے شرم کرتے ہوئے اسے دوبارہ ذہن میں نہیں لانا چاہیے۔یہ تو کتے کی طرح قے کر کے چاٹنے والی بات ہے اور اپنے اندر آگ کا انگارہ رکھنے والی بات ہے۔

ہمیں دوسروں کے ساتھ وہ سلوک کرنا چاہیے جس کی ہم دوسروں سے توقع رکھتے ہیں۔جس طرح ہم میں سے ہر ایک اللہ سے معافی کا طلب گار ہے اور معافی کی امید رکھتا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی معاف کرنا سیکھیں کیونکہ اللہ بھی معاف کرنے والے کو معاف کرتا ہے۔جو لوگ ایک دوسرے کو معاف نہیں کرتے اللہ بھی انہیں معاف نہیں کرتا۔کتنی ہی ایسی اسلامی روایات ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ معاف نہ کرنے اور ہمیشہ جگالی کرنے والوں کو عام تو عام خاص مواقع اور تہواروں جیسے لیلۃ القدر،نصف شعبان کی رات،سموار، جمعرات اور دیگر کئی مواقع پر بھی اللہ پاک معاف نہیں کرتا جن کے بارے میں واضح احادیث موجود ہیں کہ اللہ ہر ایک گنہگار کی بخشش فرما دیتا ہے۔ایسے مواقع پر بھی اللہ فرشتوں سے کہتا ہے کہ ان جگالی ''شحن'' کرنے والوں کا معاملہ ایک طرف رکھ دو جب تک یہ ایک دوسرے کو معاف نہ کر دیں۔عربی اصطلاح ''شحن'' دراصل اس جگالی کرنے والے کو کہتے ہیں جو ہر وقت چارج رہتے ہیں۔یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو عموماً بلڈ پریشر اور دیگر اس طرح کی بیماریوں کا زیادہ شکار ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان کے خواب بھی ہمیشہ ڈراؤنے اور نقصانات والے ہوتے ہیں۔

ایک خاتون جس کے بچے بھی پروفیسر ہیں کہ حوالے سے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ماہر نفسیات کے

پاس آئی اوراس سے کہا کہ: ’’ وہ رات بھر سونہیں سکتی ، اسے بہت ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔ان خوابوں میں اکثر ان کی ساس مرکزی کردار ہوتی ہے۔ ماہرنفسیات نے ساری بات سن کر اس سے کہا کہ آپ ساس کو معاف کردیں اللہ پاک آپ کے لئے آسانی پیدا کرے گا۔ وہ فوت ہوگئی ہیں آپ بھی ان کا لاشہ اپنے اندر سے نکال کر دفن کردیں وہی مردہ آپ کو تنگ کررہا ہے۔اس پر وہ خاتون کہنے لگی کہ انہوں نے میرے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں معاف تو میں ان کو کسی صورت نہیں کروں گی۔ ماہرنفسیات نے یہ سن کر اس سے کہا کہ پھر یہ خواب بھی ختم نہیں ہونگے۔ یہ عذاب باہر نہیں آپ کے اندر ہے اور بدبو باہر سے نہیں آپ کے اندر سے آتی ہے، کیونکہ مردہ آپ نے تہہ خانے میں رکھا ہوا ہے۔‘‘

ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے زمین پر چلتا پھرتا جنتی دیکھنا ہے وہ اس شخص کو دیکھ لے جو ابھی آرہا ہے۔سب کی نظریں مسجدِ نبوی کے دروازے پر لگ گئیں، ایک صاحب داخل ہوئے وضو کا پانی ان کی ڈاڑھی کے بالوں سے ٹپک رہا تھا اور جوتے انہوں نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے۔دوسرے دن بھی یہی مکالمہ ہوا اور وہی داخل ہوئے، تیسرے دن بھی یہی مکالمہ ہوا اور وہی داخل ہوئے۔اس پر حضرت عبداللہؓ کو تجسس ہوا کہ یہ بندہ کرتا کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل تین دن سے اس کے جنتی ہونے کی بشارت دے رہے ہیں۔

وہ اس بندے کے پیچھے لگ گئے اور اس سے کہا کہ چچا میرے گھر والوں سے کچھ معاملات ہوگئے ہیں آپ مجھے کچھ دن اپنے گھر رکھ لیں۔تین رات وہ مسلسل اس کے گھر رہے اور رات بھر جاگتے رہے کہ یہ بندہ کون سی خاص عبادت کرتا ہے؟ اس نے کوئی خاص عبادت نہیں کی، بس عشاء کی نماز پڑھی اور سو گیا۔رات کو جب کبھی کروٹ بدلتا تو سبحان اللہ کہہ دیتا اور بس صبح اٹھ کر فجر پڑھ لیتا۔عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ جب اس کے عمل کی حقارت میرے دل میں آنے لگی تو میں نے اس کو اصل بات بتا دی کہ تین دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشارت دیتے رہے اور تینوں دن آپ مسجد میں داخل ہوتے رہے، جس کی وجہ سے میں آپ کا عمل دیکھنا چاہتا تھا۔اس پر اس بندے نے کہا کہ بھتیجے عمل تو میرے پاس وہی ہے جو تم نے دیکھ لیا ہے البتہ ایک بات ہے جو میں کرتا ہوں اور وہ یہ کہ: ’’میں رات کو ہر ایک سے متعلق اپنا سینہ صاف کر کے سوتا ہوں، کسی کے بارے میں میرے

دل میں کوئی رنجش نہیں ہوتی''۔ جب اس بات کا تذکرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جس سے بھی ہو سکے رات کو سونے سے پہلے سینہ صاف کر کے سوئے''۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ صبح پھر ان رنجشوں کو سینے میں جگہ دے لے بلکہ جب معاف کیا سو معاف کیا۔

دوسرا واقعہ آخرت کے بارے میں ہے۔ حدیث قدسی کے مطابق فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ اللہ پاک ایک شخص کو اپنے قریب کرتے کرتے اتنے قریب کر لیں گے کہ اس کے شانے پہ اپنا دستِ مبارک ٹیک لیں گے اور اسے اس کے گناہ یاد کرائیں گے وہ ان سب کو تسلیم کرے گا۔ پھر اللہ پاک اسے کہیں گے کہ میں نے یہ سب معاف کیے اور جانتے ہو کہ کیوں معاف کیے ہیں؟ وہ کہے گا کہ اے اللہ میں نہیں جانتا کہ تو نے میرے یہ گناہ کیوں معاف کر دیے جبکہ تو نے ابھی ابھی انہیں گنوایا ہے۔ اللہ پاک فرمائیں گے ''اس لیے کہ تو بھی تو لوگوں کو معاف کر دیتا تھا، پھر معاف کرنے میں تو مجھ سے آگے تو نہیں نکل سکتا، میں سب سے بڑا معاف کرنے والا ہوں''۔

ایک خان صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جب بھی گانے سننے سے توبہ کرتے تو ٹیپ ریکارڈر کی ساری کیسٹیں نکال کر اچھی طرح پیک کر کے بریف کیس میں رکھ دیتے۔ ان سے پوچھا گیا کہ جب آپ توبہ کر رہے ہیں تو ان کو توڑ کیوں نہیں دیتے تو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے بھائی صاحب میں یہ غلطی پہلے کر چکا ہوں، پھر جب وہ والے گانے سننے کو جی کیا تو خانہ خراب پوری ابوظہبی میں وہ کیسٹ نہیں ملی مجبوراً مجھے پشاور سے منگوانی پڑی تھی۔ بس اس دن کے بعد میں جب توبہ کرتا ہوں تو کیسٹیں سنبھال دیتا ہوں۔

اس لیے اگر ممکن ہو سکے تو اٹھتے بیٹھتے، کھڑے، لیٹے دوسروں کی زیادتیوں کی جگالی نہ کیا کریں۔ جب معاف کیا کریں تو دل سے معاف کیا کریں اپنے ساتھ چکر نہ کیا کریں خان صاحب کی طرح کسی دوسرے وقت کے لیے وہ کیسٹیں سنبھال کر نہ رکھا کریں۔ یہ جگالی دنیا میں بھی آپ کو کسی کام کا نہیں چھوڑے گی اور آخرت میں بھی تباہ کن ہوگی۔

☆☆☆

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

''ایک بڑے اسکول کے چھوٹے سے بچے کو جب میں نے کلاس میں ریپر پھینکتے دیکھا تو میں نے کہا بیٹا اس ریپر کو اٹھائیں اور ڈسٹ بن میں ڈالیں، تو اس بچے نے جھٹ جواب دیا کہ ''انکل! میں کوئی سوئیپر تھوڑی ہوں.....تھوڑی دیر میں سوئیپر انکل آ کر اٹھا لیں گے۔''

یہ اس بچے کا جواب نہیں تھا، یہ اس اسکول کا جواب تھا جہاں سے وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یہ صرف کسی ایک مخصوص ادارے کی بات نہیں نہ ہی اس کا تعلق کسی مخصوص بچے سے ہے۔ اگر ہم اپنے پورے نظام تعلیم اور نظام زندگی کا جائزہ لیں تو ایسی ہی صورت حال آپ کو ہر جگہ دیکھنے کو ملے گی۔ ہمارا سارا نظام تعلیم کھوکھلی بنیادوں پر قائم ہے۔ کلاس روم سے لے کر ادارے تک اور ادارے سے واپس گھر تک آپ کو کوئی ایک جگہ بھی ایسی نہیں ملے گی جہاں ان معصوم نونہالوں کی اس طرح تربیت ہو کہ وہ جب تعلیمی ادارے سے فارغ ہو کر عملی زندگی میں قدم رکھیں تو مکمل تربیت یافتہ ہوں۔

ہمارا نظام تعلیم نونہالان وطن کو محض نمبرات کے لیے دوڑاتا اور تیار کرتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ استاد اور طالب علم دونوں کی کلاس میں پوری توجہ صرف اور صرف ان نمبرات تک محدود رہتی ہے۔ ایک استاد کلاس میں داخل ہونے کے بعد واپس کلاس سے نکلنے تک اپنا سارا وقت صرف اور صرف اپنے متعلقہ مضمون تک ہی مرکوز رکھتا ہے۔ نتیجتاً بچہ اس مضمون کی حد تک تو مہارت حاصل کر لیتا ہے مگر کرداری تربیت سے نابلد رہتا ہے۔

تعلیمی نظام کے بوسیدہ ہونے کا اندازہ صرف اس ایک بات سے لگا لیجیے کہ ہر ایک شعبہ زندگی میں بھرتی ہونے کے بعد متعلقہ فرد کو باقاعدہ نوکری شروع کرنے کے لیے تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہر محکمہ اپنے اپنے ادارے کے ملازمین کے لیے لازمی بنیادی تربیت کا بندوبست کرتا ہے جس سے گزر کر وہ فرد اس شعبے میں کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ مگر جب بات شعبہ تعلیم کی

آتی ہے تو اس بات کی ضرورت سرے سے ہی نہیں محسوس کی جاتی کہ جس استاد کو کلاس میں بھیجا جا رہا ہے اس کے ذمہ نسل نو کی تربیت کی ذمہ داری ہے جس کے لیے استاد کا خود تربیت سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔

اساتذہ کی تربیت کے لیے قائم کیے گئے اداروں کا کردار بھی دوہرا اور بہت خوفناک ہے۔ محض فیسوں کی وصولی کے لیے یہ ادارے اس خالصتاً پروفیشنل ڈگری جسے بی ایڈ، ایم ایڈ، ایم اے ایجوکیشن، ایم فل اور پی ایچ ڈی ایجوکیشن کہا جاتا ہے اور جس کی تربیت کے لیے اس استاد کا کلی طور پر وہاں موجود رہنا اور زیر تربیت ہونا ضروری ہوتا ہے حاضری سے استثنا دے دیتے ہیں۔ یوں مستقبل کے یہ معمار پرائیویٹ طور پر صرف پرچہ کی حد تک امتحان میں شامل ہوتے ہیں اور نقل اور دیگر امدادی ذرائع کے زور پر یہ ڈگری حاصل کر کے تربیت یافتہ اساتذہ میں خود کو شمار کر کے نوکری حاصل کر کے آنے والی نسلوں کا بیڑا غرق کرتے ہیں۔ یہی اساتذہ اپنی خود ساختہ تعلیمی تربیت کے بل بوتے پر نسل نو کی خام تربیت کا آغاز کرتے ہیں اور خود کو مثالی استاد اور ممتاز ماہر تعلیم کہلواتے ہیں۔

اسی طرح استاد کا اپنا کردار کلاس میں مثالی نہیں ہوتا اس کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے۔ بچے کے لیے یہ مشکل ہوتا ہے کہ وہ استاد کی کہی ہوئی بات پر عمل کرے یا پھر اس کے اس کردار کو اپنائے جو وہ کلاس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہی وہ طالب علم ہے جو عملی زندگی میں جب داخل ہوتا ہے تو اس کی دوہری شخصیت خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے دوہرے معیار کی حامل ہو جاتی ہے۔

اسی طرح گھروں میں والدین کا کردار بھی دوہری شخصیت کا حامل ہوتا ہے ان کے قول و فعل کا واضح تضاد بھی بچے کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی بچہ معاشرے میں جب فعال فرد کے طور پر داخل ہوتا ہے تو اس کے اساتذہ، والدین اور معاشرے میں موجود دیگر افراد کی دوہری بلکہ مختلف مواقع پر کئی پرتوں پر مشتمل شخصیت کے اوصاف اس کو ایک پیچیدہ شخصیت کے طور پر معاشرے میں لاتے ہیں۔ یوں یہ سلسلہ نسل در نسل وطن عزیز میں جانے کب سے جاری ہے اور جانے کب تک جاری رہے گا۔ ایسی دوہری شخصیت والی مثالوں سے ملک کا چپہ چپہ بھرا پڑا ہے۔ ذرا غور کر کے دیکھ لیجیے آپ کو قدم قدم اور گھر گھر میں ایسے بیسیوں مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔

آپ نے کئی ماؤں کو دیکھا ہوگا جو اپنے بچوں کو چیخ کر کہتی ہیں کہ چیخا مت کرو میں کوئی بہری نہیں ہوں اور کئی باپوں کو مارتے ہوئے دیکھا ہوگا جو بچوں کو کہتے ہیں آئندہ بھائی کو ہاتھ مت لگانا ورنہ ہاتھ توڑ دوں گا۔آپ نے بہت سے لوگوں کو خود ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرتے ملک کے ٹریفک کے نظام کو گالیاں دیتے دیکھا ہوگا۔اسی طرح کئی لوگوں کو فٹ پاتھ پر پان کی پیک مارتے،اپنی گلی کے سامنے والی گلی میں کچرا ڈالتے،سگریٹ پی کر زمین پر ڈالتے اور پھر دبئی اور لندن کی صفائی ستھرائی کا ذکر کرتے دیکھا ہوگا۔

سردیوں میں ایندھن کے لیے یا اپنے مکان کی تعمیر کے دوران اچھے خاصے درختوں کو کاٹتے اور پھر سنگاپور اور یورپ کی ہریالی کا ذکر کرتے سنا ہوگا۔ بہت سے لوگوں کو اپنے گھر کے صحن کو بڑھاتے اور گلی گھیرتے دیکھ کر اور ان ہی کی زبان سے امریکا اور یورپ کی چوڑی چوڑی گلیوں اور سڑکوں کا ذکر سنا ہوگا۔آپ نے مسجد کے باہر اور سڑک کے درمیان ایسے لوگوں کو گاڑی پارک کرتے دیکھا ہوگا جن کو نماز اور نماز جنازہ میں دیر ہو رہی ہوتی ہے اور پھر ان ہی لوگوں سے کئی کئی گھنٹوں حقوق العباد پر درس دیتے سنا ہوگا۔

نجانے کتنے لوگوں کو شادی میں وقت کی پابندی اور سادگی پر جلتے کڑھتے دیکھا ہوگا اور پھر ان ہی کے گھر کی شادیوں میں وقت کو برباد ہوتے اور سادگی کی دھجیاں اڑتے دیکھی ہوں گی۔اور پتہ نہیں کتنے لوگوں کو اور کیا کیا کرتے اور کیا کیا کہتے دیکھا ہوگا،کوئی ایک بات ہو تو نقل کی جائے۔

ہم آخر کب تک اپنی کوتاہیوں کا دوش دوسروں کو دیتے رہیں گے۔کب تک تمام فساد کی ذمہ داری حکومت وقت کے کاندھوں پر ڈالتے رہیں گے اور کب تک ہر الزام سے خود کو بری کرتے رہیں گے۔کوئی کام تو ایسے ہوں گے جو ہمارے کرنے کے ہیں اور جو صرف اور صرف ہماری ذمہ داری میں آتے ہیں۔

☆☆☆

ہم اور ہمارے رویے

ہم لوگوں کے ساتھ نہیں رہتے ان کی عادات کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہماری عادات ہمارے مجموعی رویوں کی عکاس ہوتی ہیں۔ یہ ایک طویل موضوع ہے کہ ہمارے رویے کیسے بنتے ہیں۔ان کے بننے میں کون کون سے عناصر کارفرماں ہوتے ہیں۔مختصراًیہ کہ ماہرین نفسیات نے ان سب رویوں کو چار درجات میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔مثبت رویہ Positive attitude

۲۔منفی رویہ Negative attitude

۳۔غیر جانبدارانہ رویہ Neutral attitude

۴۔بیمار رویہ Sicken attitude

ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں بدقسمتی سے پہلے تین درجاتی رویے کا فقدان ہے اور خال خال ہی کہیں دکھائی دیتا ہے۔اگر دیکھا جائے تو بحیثیت مجموعی ہمارے رویے بدقسمتی سے غیر صحت مند ہیں۔ گھروں، بازاروں، دفتروں، ہسپتالوں سے لے کر تعلیمی اداروں تک ہمارے آس پاس صبح سے شام تک یہی رویے گردش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ہم بظاہر صحت مند ہو کر بھی صحت مندانہ رویوں سے عاری ہیں۔زندگی کے بارے میں ہماری اپنی کوئی ترجیحات نہیں اور جن چیزوں کو ہم نے اپنی ترجیحات قرار دیا ہوا ہے وہ ترجیحات ہیں ہی نہیں۔

ایک آسٹریلوی سیاح پاکستان کی سیاحت پر آیا۔وہ لکھتا ہے کہ ایک بار ہماری گاڑی ایک ریلوے پھاٹک پر کھڑی تھی اور ہم اس انتظار میں تھے کہ کب ٹرین گزرے اور پھاٹک کھلے اور ہم گزریں کہ اسی اثناء میں ایک شخص تیزی سے ہمارے پاس سے سائیکل پر گزرا۔ پھاٹک پر پہنچ کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا، سائیکل کو سر پر اٹھایا، تیزی سے پیدل پھاٹک اور پٹڑی کو عبور کیا اور سائیکل چلاتا ہوا تیزی سے بھیڑ میں گم ہو گیا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ پاکستانی قوم وقت کی کتنی پابند ہے اور قدر کرتی ہے۔اس شخص نے اپنی جان کو

خطرے میں ڈال کر محض وقت بچانے کے لیے پیدل پھاٹک عبور کیا ہے۔ پھاٹک کھلنے پر جب ہم آگے روانہ ہوئے تو میں نے کچھ فاصلے پر دیکھا کہ ایک جگہ لوگوں کی بھیڑ ہے اور وہی شخص سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے سڑک کنارے مداری کے کرتب دیکھ رہا ہے۔ اس دن مجھے پاکستانیوں کی ترجیحات کا اندازہ ہو گیا۔

یہ رویہ ہمارے ہاں انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر رائج ہے۔ کسی ادارے کی مثال لے لیجیے۔ ہمارے ہاں ایک بڑا طبقہ اداروں میں ایسا ہے جن کا رویہ ادارے کے ساتھ مجبور محض کا سا ہے گویا کسی نے اسے عمر قید سنا دی ہو۔ وہ ادارے میں ہونے والی کسی بھی سرگرمی سے بشمول کام کے خود کو لاتعلق رکھتے ہیں۔ اپنی جائے روزگار workplace اور کام کو اپنا جائے سکون اور جائے تفریح بنانے کی بجائے جائے مشقت اور اذیت سمجھتے ہیں اور کام سے فرار کو اس کا حل سمجھتے ہیں۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس وقت وہ کوئی اور ضروری کام کر رہے ہوں۔ بلکہ بہت حد تک امکان ہے کہ اس آسٹریلوی سیاح کے مشاہدے کی طرز کا کوئی کام کر رہے ہوں۔

بطور قوم ہم پر ایک مثال صادق آتی ہے کہ ہم ''کارِ فرصت'' کو دماغ میں اور کام کو ''فرصت کی نوک'' پر رکھتے ہیں جبکہ اہل مغرب کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ کام کو دماغ میں اور ''کارِ فرصت'' کو ''فرصت'' پر اٹھا رکھتے ہیں۔

ہمارے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہم 50% زندگی غلطیاں کرنے اور باقی 50% ان غلطیوں کے دفاع میں گزار دیتے ہیں۔ حالانکہ آدم غلطی مان کر انسان اور عزازیل غلطی نہ مان کر اور اس کا دفاع کر کے ابلیس ٹھرا۔

ہمارے رویوں کی دو سطحیں ہیں ایک شعوری اور دوسری غیر شعوری سطح۔ غیر شعوری رویے میں ہمارے گھر اور باہر کا ماحول اثر انداز ہوتا ہے جبکہ شعوری رویوں میں ہم وقت، صلاحیتیں اور تعلیم کے ذریعے تبدیلی لا سکتے ہیں۔ ماہرین تعلیم نے تعلیم کی مختصر ترین تعریف بھی یہی کی ہے کہ ''رویوں میں تبدیلی کا نام تعلیم ہے۔'' آپ کو معاشرے میں ایسے ہزاروں ڈگری ہولڈر دکھائی دیں گے جن سے مل کر ان کی جہالت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات بظاہر کم پڑھا لکھا زیادہ باشعور مل جاتا ہے۔ گویا ہماری ڈگریاں ہمارے

تعلیم پر ہونے والے اخراجات کی رسیدیں ہیں جبکہ اصل تعلیم وہ شعور اور رویہ ہے جو اساتذہ کے زیرِ تربیت سالہا سال کی ریاضت کے بعد چٹکی بھر کستوری کی صورت میں ہمارے ہاتھ آتا ہے۔اس معاملہ میں بھی ہم بطور قوم ایسے ہیں کہ اس چٹکی بھر کستوری کو بھی اپنی ذات کا حصہ بنا کر زندگی گزارنے کی بجائے اپنے قبیلے، اپنی جماعت یا مال و دولت کے زور پر زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

کسی سیانے نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر ہم انگریزی حروف تہجی elphabets کے 26 حروف میں سے ہر حرف کو ایک عدد شمار کریں اور A سے Z تک 1 سے 26 کے اعداد کو بالترتیب نمبر دیتے جائیں اور پھر دنیا میں کامیابی کی جتنی بھی شکلیں ہو سکتی ہیں ان کو ذہن میں لا کر اس لفظ کو ان اعداد کی کسوٹی پر پرکھیں تو کسی بھی لفظ کے اعداد 100 نہیں بن سکتے سوائے رویے یعنی ATTITUDE کے۔گویا رویہ ہی وہ واحد محرک ہے جو ہماری کامیابی میں 100% کردار ادا کرتا ہے۔

اگر ہم دنیا کے بدلتے ہوئے منظر نامے میں بطور مہذب قوم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انفرادی اور اجتماعی سطح پر اپنے رویوں پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔تعلیمی اداروں کا رویوں کی تبدیلی میں کلیدی کردار ہوتا ہے اور استاد اس تبدیلی کا بنیادی مرکزہ ہے۔طالب علم کے رویے میں تبدیلی کے لیے استاد کے اپنے رویے میں تبدیلی ضروری ہے۔اسی طرح گھر معاشرے کی وہ بنیادی اکائی ہے جس سے جہاں بانی کا آغاز ہوتا ہے۔گویا والدین اور اساتذہ کا رویوں میں دیگر شعبہ جات کی نسبت کردار اہم اور بنیادی ہے۔

مختصراً یہ کہ اگر دل احساسات کا گھر ہے تو دماغ ان احساسات کا سرچشمہ۔ہمارے تمام تر رویے جو ہمارے دل و دماغ میں نمو پاتے ہیں اگر ان کو محنت، کوشش اور لگن سے سینچا جائے تو انسان معراجِ انسانیت پر جا پہنچتا ہے۔بقول حالی

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

☆☆☆

Be Cruel to be Kind

یہ محض ایک مقولہ نہیں نہ ہی شیکسپیئر کے ڈرامے ہیملٹ میں ایک کردار کی طرف سے ادا ہونے والا محض ایک ڈائیلاگ ہے بلکہ اپنے اندر معانی ومفاہیم کا ایک جہان لیے ہوئے ہے...... ذرا غور کریں اور اس ایک قول کی گہرائی میں اتر کر دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اس ایک قول میں کائنات کی Existance اور بقا کا پورا فلسفہ لیے ہوئے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ Be cruel to be kind

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت وراہنمائی کے لیے ہر دور میں انبیاء ومرسلین کو بھیجا اور ہر نبی کو دیگر صفات کے ساتھ ساتھ بشیراً ونذیرا کی دو خصوصی صفات سے متصف کیا گیا۔ انبیاء علیہم السلام نے انسانوں کی ہدایت وراہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے جہاں شفقت ونرمی کے ساتھ پیغام حق پہنچایا وہیں نہ ماننے اور ظلم وجبر برپا کرنے والوں کے خلاف بوقت ضرورت تلوار بھی اُٹھائی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جہاں قرآن کریم نے وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِلعٰلَمِین کہہ کر آپؐ کو سراپا رحمت قرار دیا اور آپؐ کی رحمت صرف انسانوں تک ہی محدود قرار نہیں دی بلکہ چرند، پرند، درند بھی اس رحمتِ بے پایاں کے حق دار قرار پائے وہیں آپؐ کی زندگی میں 27 غزوات اور 58 سرایا اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ ظلم وجبر کو روکنے کے لیے بعض اوقات تلوار اُٹھانا قرین انصاف ہوتا ہے۔ گویا آپؐ کے صفاتی ناموں میں سے بشیر ونذیر وہ دو صفاتی نام ہیں جو جہاں ایک طرف آپ کو خوشخبری سنانے والے کے ہیں وہیں ظالموں اور جابروں کے خلاف ڈر سنانے والے کے بھی ہیں۔

ذرا جنت وجہنم کے فلسفے پر غور کر کے دیکھ لیجیے ساری حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔ جنت اگر فرماں برداروں کے لیے خوشخبری اور راحت کا استعارہ ہے تو جہنم نافرمانوں اور ظالموں کے لیے عبرت کا مقام، ایک مجذوب کے بارے میں حکایت ہے کہ وہ ایک ہاتھ میں روشن مشعل اور دوسرے میں پانی کا لوٹا لے کر گلی گلی نگر نگر میں گھومتا پھرتا۔ کسی اللہ والے نے اس سے اس کی وجہ دریافت کی تو اس کا جواب تھا کہ میں مشعل سے جنت کو آگ لگاؤں گا اور لوٹے سے جہنم کی آگ بجھاؤں گا تاکہ لوگ جنت کے شوق یا جہنم کے

خوف سے عبادت نہ کریں بلکہ اس لیے عبادت کریں کہ اللہ بندگی کے لائق ہے۔

آپؐ کو ایک نوجوان کی بیماری کا علم ہوا آپ مع اصحاب اس کے پاس تشریف لے گئے۔ آپؐ نے دیکھا کہ وہ عجیب جان کنی کے عالم میں اور سخت تکلیف میں تھا۔ آپؐ نے اس سے حال احوال دریافت کیا اور اس سے پوچھا کہ تمھاری اس وقت کی کیا کیفیات ہیں اور تم کیا محسوس کر رہے ہو جب کہ تم دنیا چھوڑ کر جا رہے ہو تو اس کا جواب یہ تھا کہ مجھے اللہ سے بخشش کی امید بھی ہے اور اپنے گناہوں پر گرفت کا خوف بھی۔ آپؐ نے فرمایا تمہاری یہ کیفیت تمہیں جنت میں لے جائے گی۔

حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ آج اگر یہ اعلان ہو جائے کہ ساری مخلوق جنت میں جائے گی اور ایک شخص جہنم میں جائے گا تو مجھے اللہ سے ڈر ہے کہ کہیں وہ ایک شخص میں ہی نہ ہوں۔ اور فرماتے کے اگر آج اعلان ہو جائے کہ سب لوگ جہنم میں جائیں گے صرف ایک شخص جنت میں جائے گا تو مجھے اللہ سے امید ہے کہ وہ ایک شخص میں ہوں گا۔ کہنے کا مطلب کہ یہ دو صفات جہاں ایک فرد اور اس کی شخصیت کو خاص نظم کے تابع رکھتی ہیں وہیں پوری کائنات کے نظم کے لیے بھی ان دو صفات کی موجودگی ضروری ہے۔

ذرا تصور کیجیے ایک بادشاہ اگر ظالم اور فساد کرنے والوں کے خلاف سخت اقدامات نہیں کرے گا تو کیا اس معاشرے میں اس کی رعایا اور پسے ہوئے طبقات سکون سے جی سکتے ہیں۔ ایک قاضی اگر ایوان عدل میں مجرموں کے خلاف سخت کارروائی نہیں کرے گا تو سماج میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ اسلام کے نظام عدل کا جائزہ لیں تو اسلام کا نظام حدود و تعزیرات جہاں بظاہر ظالمانہ دکھائی دیتا ہے اور قصاص و رجم جیسی سخت سزائیں سناتا ہے جن کے خلاف آج مغربی پروپیگنڈہ انہیں ظالمانہ قرار دے کر ان کے خاتمے کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہیں قرآن قصاص میں زندگی ہے کا اعلان بھی کرتا ہے۔ گویا اگر ظالموں کے ظلم پر ان کے خلاف موثر کارروائی نہ کی گئی اور ان کا سد باب نہ کیا گیا تو زمین فساد سے بھر جائے گی۔ ہر ایک شعبہ زندگی سے وابستہ افراد بالخصوص جن کے پاس کوئی اختیار اور ذمہ داری ہے جب تک وہ برے اور کام چور ماتحتو ں کے خلاف جبار وقہار نہیں ہوں گے مظلوم ماتحت جی نہیں سکیں گے نہ ہی اس ادارے کا نظم ونسق آگے بڑھے گا۔

ایک صاحب اپنا ذاتی احوال بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ایک دن دفتر میں بیٹھے ہوئے ایک

شخص اپنے کسی کام کی غرض سے حاضر ہوا۔ باتوں باتوں میں مجھ سے کہنے لگا کہ آپ کے جس طرح کے حالات ہیں آپ اسماءالحسنٰی کا کثرت سے ورد کیا کریں۔ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اوراسے رخصت کر دیا۔ چند دن بعد مجھے اس کی کہی ہوئی بات یاد آئی تو میں اس کی بات پر غور کرنے لگا کہ اس نے مجھے کیوں ان اسماء کے ورد کی تلقین کی ہے۔

جب اسمائے الٰہی پر غور کرنے لگا تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے اللہ کے ہر اسم کی قدم قدم پر مجھے ضرورت ہے۔ اچانک یہ خیال ذہن میں جاگزیں ہوا کہ اللہ کے جمالی اسماء کی حد تک تو مجھے ضرورت ہے مگر جلالی اسماء جیسے جبار، قہار کی بھی مجھے کوئی ضرورت ہے؟ ایک ایک بات پر غور کرتے اچانک دل و دماغ کے پردے وا ہونا شروع ہوئے اور مجھے سمجھ آنے لگی کہ بلا شبہ اللہ کے جلالی اسماء کی بھی مجھے اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ اس کے جمالی اسماء کی ضرورت ہے۔ مجھے سمجھ آنا شروع ہوا کہ میں جس عہدے اور ذمہ دار کرسی پر بیٹھا ہوں وہاں رہتے ہوئے میرا اپنے ماتحتوں اور دیگر کام کرنے والے عہدیداروں کے ساتھ رویہ کس طرح کا ہونا چاہیے۔ ان ماتحتوں میں کچھ تو وہ ہیں جو اپنا کام پوری تندہی سے سرانجام دیتے ہیں مگر ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو بددیانت اور کام چور بھی ہیں۔ کیا میرا سب کے ساتھ رویہ ایک جیسا ہی ہونا چاہیے یا کام نہ کرنے والوں سے باز پرس کرنا بھی میرے فرائض منصبی میں شامل ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ معاشرہ میں زندگی گزارتے ہوئے Be Cruel to be Kind کے عملی فلسفہ کو سمجھ کر زندگی میں آگے بڑھیے۔ آپ اگر حد سے زیادہ شفیق اور مہربان ہو جائیں گے تب بھی فاسق اور شرپسند حضرات اپنی شرپسندی میں حد سے بڑھ جائیں گے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے جتنے بھی اسباب ہیں اور ان سب اسباب کی الگ الگ توجیہات کی جاسکتی ہیں مگر ان میں سے ایک بڑا سبب اور وجہ ان کا حد سے زیادہ نرم ہونا بھی تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شرپسند اپنی شرپسندی میں حد سے بڑھ گئے اور سلطنت اسلامی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ اس کا نقصان صرف ان کی شہادت تک ہی محدود نہ رہا بلکہ ان کے فرمان کہ ''اگر آج تم نے مجھے ناحق قتل کر دیا تو قیامت تک اکٹھے نہ ہو سکو گے''، عملی طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ امت کا جو شیرازہ اس ایک واقعے سے بکھرا دوبارہ کبھی سمیٹا نہ جا سکا۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جن سات اشخاص کو اپنے عرش کے سائے میں جگہ عطا فرمائے گا ان میں سے ایک سلطان عادل بھی ہوگا۔ یہ وہ شخص ہوگا جو عدل کو قائم کرتے ہوئے کسی طرح کے تعلق کو خاطر میں نہیں لائے گا حتیٰ کہ اگر معاملہ اس کی ذات کے خلاف بھی جاتا ہوگا تب بھی وہ اس معاملہ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا۔ اسلام نے اخلاق حسنہ کی جن صفات کو معاشرے کے لیے ضروری قرار دیا ہے ان میں عدل سرفہرست ہے۔ یہ وہ صفت ہے جو ادنیٰ ترین فرد سے اعلیٰ ترین فرد تک سب کے لیے ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ کو جب خلیفہ کے لیے نامزد کیا جانے لگا تو لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ حضرت عمرؓ سخت گیر ہیں وہ امور حکومت کیسے سرانجام دے سکیں گے تو ان کا جواب تھا کہ احساس ذمہ داری ان میں نرمی پیدا کر دے گا اور ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے دور کو تاریخ اسلامی کا سب سے بہترین دور شمار کیا جاتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ معاشرے کفر کے ساتھ ہزاروں سال تک قائم رہ سکتے ہیں اس لیے کہ اللہ کو ان کے کفر سے کوئی سروکار نہیں ہوتا مگر ظلم کے ساتھ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔ اللہ نے اسی لیے معاشروں میں فساد کو قتل سے بڑھ کر قرار دیا ہے چنانچہ اس فساد کو روکنے کا واحد ذریعہ Be Cruel to be Kind ہونا ہی ہے۔

☆☆☆

بھاگ ورنہ آدمی کی موت مارا جائے گا

کتوں کے بارے میں بہت سے اقوال مشہور ہیں یہ کہ کتا اپنے مالک کا وفادار ہوتا ہے، بھوکا پیاسا رہ کر بھی مالک کا در نہیں چھوڑتا، جو روکھی سوکھی مل جائے کھا کر گزارہ کر لیتا ہے وغیرہ۔ ہمارا اس بات سے یہ مقصد نہیں کہ ہم یہاں آپ کو اُن کے خواص گنوا رہے ہیں۔ بلکہ ہم جس سیارے (زمین) پر رہائش پذیر ہیں اس پر حضرت انسان کے علاوہ ہزاروں قسم کی مخلوق موجود ہے۔لیکن جو تعلق انسان اور کتے کا آپس میں ہے وہ کسی اور مخلوق کا نہیں۔ بلکہ ہم نے تو بڑوں کو یہ بھی کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب اللہ نے آدم کی تخلیق مکمل کر لی ور فرشتوں میں یہ چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ یہ خاک کا پتلا زمین پر اللہ کا نائب ہوگا تو فرشتوں کے سردار عزازیل (ابلیس) نے حقارت سے اس خاک کے پتلے پر تھوک دیا۔ فرشتے نے آدم کے پتلے کے پیٹ (ناف) پر سے جہاں تھوک پڑا تھا مٹی الگ کر لی اور بعد میں اُس مٹی سے کتا تخلیق کیا گیا۔ اسی لئے اس میں انسانوں سے اُنس ہے۔ جبکہ اپنا یہ خیال ہے کہ شاید یہ ابلیس کے تھوک کی خاصیت ہے کہ انسانوں کو کاٹنا کتوں کا محبوب مشغلہ ہے اور پھر درجن بھر ٹیکے مفت میں لگوانے پڑ جاتے ہیں۔صرف یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تو ٹیکے لگوانے کے باوجود بھی بندہ سچ مچ پاگل ہو کر ''ہیں'' سے ''تھا'' ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود انسان اور کتے آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

شاید یہ انسان اور کتے کے صدیوں پر محیط تعلق کا اثر ہے کہ ان دونوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا اور اپنایا ہے۔ مثلاً پہلے مشہور تھا کہ کتا کتے کا بیری ہوتا ہے مگر اب انسانوں میں باہم رہنے سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر ہو گئے ہیں اور اب نہیں لڑتے۔ اس کے مقابلے میں انسانوں نے کتوں سے لڑنا سیکھا ہے اور اب بندہ بندے کا بیری ہے۔ اگر کبھی آپ ان کو آپس میں باہم دست و گریباں دیکھیں تو پہلے ایک آدمی دوسرے کا گلہ پکڑتا ہے پھر ٹانگ کھینچتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے منہ کو نوچنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ منہ سے رال ٹپک رہی ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ بھونکنے اور غرانے کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ جب ان میں سے ایک دوسرے پر حاوی ہو جاتا ہے تو پھر مد مقابل کو اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک باہر سے کوئی

آ کر ان کو الگ نہیں کرتا۔

انسانوں کی طرح کتوں کی بھی کئی نسلیں ہیں مثلاً السیشن ،بلٹیر یر، وغیرہ۔لیکن خاص بات یہ ہے کہ ان میں انسانوں کی طرح نسلی تفاخر بالکل نہیں پایا جاتا۔اسی طرح وہ گورے اور کالے کے زعم میں بھی نہیں پڑتے نہ ہی وہ اپنے علاوہ کسی دوسری نسل کو ختم کرنے کے درپے ہوتے ہیں بلکہ اُنہیں کتا اور صرف کتا ہونے پر فخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتا چاہے مشرق کا ہو یا مغرب کا وہ آپس میں بھائی بھائی ہے۔ ہاں البتہ مغرب میں کتوں کو انسانوں سے زیادہ حقوق حاصل ہیں اور مشرق میں کتوں اور انسانوں کی حیثیت ایک سی ہے جہاں چاہا ، جب چاہا مار دیا۔مغرب میں تو کتوں کے نام پر انسانوں کے نام رکھے جاتے ہیں جیسے بش ،ٹونی، ٹام، بلی وغیرہ۔

پچھلے دنوں امریکہ کی ایک خبر اخبارات میں شائع ہوتی رہی۔خبر کے مطابق ایک امریکی کو اس کے پالتو کتے نے کھیلتے ہوئے کاٹ لیا۔اس پر امریکی کو بہت غصہ آ گیا اُس نے بلا اُٹھا کر اس کے سر میں دے مارا جس سے کتا موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ یہ سارا منظر اس کا پڑوسی دیکھ رہا تھا۔اس نے اس ظلم پر رپورٹ کر دی۔ جس پر پولیس اور جانوروں کے حقوق کی تنظیمیں حرکت میں آ گئیں۔احتجاج ہونے لگا،عدالت میں مقدمہ چلا اور اس امریکی کو سزا ہو گئی۔ایک اور غیر ملکی میڈیا رپورٹ کے مطابق ایک اور یورپی شہری کو غیر قانونی لڑائی کے لیے سو سے زیادہ کتے پالنے کے جرم میں 475 سال قید کی سزا سنائی گئی ہے۔

کتنے خوش قسمت ہیں امریکہ اور یورپ میں بسنے والے کتے اور کتنے بدقسمت ہیں مشرق میں بسنے والے انسان کہ ایک امریکی صدر نے اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر دس لاکھ سے زائد لوگ مار ڈالے۔ دو مما لک کو کھنڈر اور راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔مشرق وسطیٰ میں عرب سپرنگ کے نام سے انتشار افراتفری اور لاقانونیت کا وہ سلسلہ شروع کرایا گیا جس پر کوئی بند بندھنے کا نام ہی نہیں لے رہا بلکہ اُلٹا امن کے نام پر وہ دہشت گردی ہو رہی ہے جس میں ہر روز سینکڑوں لوگ مر رہے ہیں۔میانمار (برما) میں جس طرح روہنگیا نسل کے انسانوں کی نسل کشی ہو رہی ہے۔فلسطین میں جس طرح نہتے اور بے گناہ مسلمانوں کے خون سے اسرائیل ہاتھ رنگ رہا ہے اور جتنے خون ریز طریقے سے انسانوں کی نسل کشی ہو رہی ہے وہ تہذیب نو کے منہ پر سب سے بڑا طمانچہ

ہے لیکن حیرت ہے کہ اس ظلم پر وہاں کا قانون ہی حرکت میں آ رہا ہے نہ جانوروں اور انسانوں کے حقوق کی تنظیمیں......

ہمارے ہاں عرصہ سے ایک رسم چلی آ رہی ہے کہ اگر کسی کی سالگرہ ہو تو کیک کٹتے ہیں، پارٹیاں ہوتی ہیں اور مبارکباد دی جاتی ہے۔ اسی طرح فوت شدہ کی برسی منائی جاتی ہے، خوان پکتے ہیں، دعائے خیر ہوتی ہے اور اس کی روح کو ایصال ثواب کیا جاتا ہے۔ مگر اب ایک اور بات تسلسل سے مشاہدے میں آ رہی ہے کہ کسی نامی گرامی شخصیت کی سالگرہ یا برسی کے موقع پر قرآن خوانی کی بجائے ایصال ثواب کے جدید طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں جن کے تحت ان مواقع پر کسی نہ کسی طرح کے ٹورنامنٹ کا انعقاد کیا جاتا ہے، ملک کے طول و عرض سے ٹیمیں منگوائی جاتی ہیں۔ ڈے نائٹ میچوں کا انعقاد کیا جاتا ہے اور ٹورنامنٹ کے فائنل کے موقع پر یہ ساری مشقت مرحوم کو ایصال ثواب کر دی جاتی ہے۔

اب تو یہ بات بھی کثرت سے مشاہدے میں آ رہی ہے کہ اس معاملہ میں کچھ حضرات تو حد سے زیادہ جذباتی واقع ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ تو خاص الخاص اس طرح کے مواقع پر کتوں، مرغوں یا بھینسوں کا دنگل رکھتے ہیں۔ اس مقابلے کے علان عام پر ملک کے طول و عرض سے کتوں اور جانوروں کے شوقین افراد اپنے اپنے کتوں اور جانوروں کو لاتے ہیں۔ اُن کی نمائش کی جاتی ہے، میلے منعقد کیے جاتے ہیں پھر ان کو باہم لڑایا جاتا ہے اور اس طرح مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کیا جاتا ہے۔

ہم نے تاریخ کے اوراق کی خوب ورق گردانی کی کہ شاید ماضی میں کہیں اس کی کوئی مثال مل جائے کہ اس رسم کا آغاز کب ہوا اور اس کا اجر مرحوم کو کس طرح پہنچتا ہے مگر باوجود کوشش کے کامیابی نہیں ہو سکی۔ ہاں اتنا ضرور پتا چلا ہے کہ ماضی میں فاتحین دشمن کو شکست دے کر ان کی کھوپڑیوں کے مینار بنا کر اپنی فتح کا جشن مناتے تھے اور آج کل مفتوحین کے شہروں کو راکھ کا ڈھیر بنا کر اُن پر یادگارِ شہدا تعمیر کی جاتی ہے۔

تاریخ سے یاد آیا کہ تاریخی حوالہ جات کے مطابق انسان اور کتے کی تاریخ تقریباً ایک جتنی پرانی ہے۔ مگر باوجود وحشی درندہ اور نجس ہونے کے کتوں کی تاریخ اتنی بھیانک نہیں ہے جتنی انسانوں کی ہے۔ آپ تاریخ کے اوراق چھان لیں آپ کو کوئی ایک واقعہ بھی نہیں ملے گا جب کتوں نے ملک گیری یا مال دولت کے

حصول کے لئے جنگیں کی ہوں، اپنے ہم جنسوں کا خون بہایا ہواور اُنہیں کتے کی موت مارا ہو۔ جتنا خون انسانوں نے اپنے ہم جنسوں کا بہایا ہے اور انہیں انسانوں کی موت مارا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل اس طرح کے لطیفے اخبارات میں شائع ہوتے اور موبائلوں میں میسیج کئے جاتے ہیں جن میں ایک کتا دوسرے سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ یار جہاں دیکھو زیادہ رش ہو وہاں سے دور رہنا۔ دوسرا: وہ کیوں؟ پہلا: ارے پگلے کوئی دھماکہ ہوگا اور تو انسانوں کی موت مرے گا۔ اسی بات کو ہمارے ملک کے ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

کہہ رہا تھا ایک کتا اپنے ساتھی سے سلیم
بھاگ ورنہ آدمی کی موت مارا جائے گا

شاید کتوں نے اپنے تحفظ اور مفاد عامہ کے پیش نظر اس طرح کے پیغامات شروع کئے ہیں۔

ہمارے ملک میں ہر دور میں جیتنے والی پارٹی اپنے تمام ممبران اسمبلی کو ایڈجسٹ کرنے کے لیے نئی نئی وزارتیں تشکیل دیتی ہے۔ اگر اس کے باوجود کچھ ممبران بچ جائیں تو ایک ایک شعبے کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے کا ایک وزیر پھر اس کا مشیر پھر مشیر کا مشیر مقرر کیا جاتا ہے۔ جیسے سابقہ ادوار میں وزیر تعلیم سکولز، وزیر تعلیم کالجز، وزیر تعمیرات شاہرات، وزیر تعمیرات عمارات، وزیر جنگلات، وزیر اکلاس وغیرہ جیسی وزارتیں تشکیل دی جاتی تھی۔ اسی طرح ایک شخص کو ایک شعبے کا وفاقی وزیر اور دوسرے کو اسی شعبے کا وزیر مملکت بنا کر زیادہ سے زیادہ ممبران کی کھپت کی جاتی تھی اور کی جارہی ہے۔

لیکن مشاہدے میں آیا ہے کہ اس کے باوجود اگر چند ایک ممبران اسمبلی پھر بھی ایڈجسٹ نہیں ہو پاتے تو وہ اسمبلی ممبر ہونے پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ ان بیچاروں کو قومی درد اور جمہوریت کو بچانے کا جذبہ اس قدر بے چین کرتا ہے کہ وہ قربانی دینے کے لئے میدان میں اتر آتے ہیں اور مجبوراً لوٹا، پیٹریاٹ، یا کوئی اور الف، ب، ج گروپ تشکیل دے کر وفاداری اور محبّ وطن ہونے کا دم بھرتے ہیں۔ صورت حال اب یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اب تو خود اس بیچارے ممبر اسمبلی کو بھی یاد نہیں کہ اس نے آج تک کتنی پارٹیاں تبدیل کی ہیں۔ اسی طرح اگر خدانخواستہ کسی ممبر اسمبلی پر کسی بھی طرح کا کرپشن کا الزام لگ جائے تو اس کا آسان حل یہ ہے کہ فوراً پارٹی تبدیل کر کے دوسری میں آجاؤ اور ہر طرح کی کرپشن سے پاک ہو جاؤ۔۔ ہمارے ہاں کتنا

آسان نسخہ ہے عمر بھر کی کرپشن سے پاک ہونے کا ......ایسا اگر اگلے جہان میں بھی ہو جائے تو سونے پہ سہاگہ......

ہمارا مشورہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں انسانوں کی فلاح و بقا کے لیے تو آج تک کوئی ایک بھی ایسی وزارت نہیں تشکیل دی جا سکی ہے جو نسل آدم کی بقا کے لیے کام کر سکے یا جس سے واقعتاً بنی آدم کو اپنی نسل کی بقا کے لیے کوئی منفعت حاصل ہوئی ہو۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی ایک ایسی وزارت ہی تشکیل دے دی جائے جو اس بے زبان مخلوق کی فلاح و بقا کے لیے کام کر سکے اس طرح جہاں اس مخلوق کا بھلا ہو سکتا ہے وہیں ایک آدھ اور ممبر اسمبلی کو وزارتی قلمدان مل جائے گا۔

☆☆☆

رہے نام اللہ کا

وطن عزیز میں گزشتہ کچھ عرصے میں تیزی سے شہدا کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے جس کی ماضی میں کہیں کوئی مثال نہیں ملتی۔ حالانکہ موجودہ دور میں ماضی کی نسبت جنگوں کی تعداد بہت کم ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک وقت تھا جب دنیا کے کسی بھی خطے میں کوئی بھی جنگجو طاقت کے زعم میں دوسرے مما لک اور اقوام پر فوج کشی کرتا اور ہزاروں لوگوں کو تہ تیغ کر کے رکھ دیتا اور یوں وہ مظلوم شہادت کے عظیم منصب پر فائز ہو جاتے۔ ماضی میں اس کی ایک مثال چنگیز خان کی دی جاتی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صرف اس ایک فتنہ منگول نے ایک صدی میں گیارہ کروڑ انسانوں کو صفحہ ہستی سے مٹایا۔ اس کی دوسری مثال جنگ عظیم اول ہے جو دو کروڑ انسانوں کو نگل گئی جبکہ جنگ عظیم دوم کے شہدا کے اعداد و شمار ریکارڈ پر چار کروڑ کی تعداد میں موجود ہیں۔

ایسی مہمات میں سینہ سپر ہونا اور جان قربان کر دینا تو سمجھ میں آتا ہے اور اس قوم کا اپنے شہدا کے کارناموں پر خراج عقیدت پیش کرنا اور اس کو یاد رکھنا تو یقیناً زندہ اقوام کا شیوہ ہے مگر جو صورت حال اہل وطن کو گزشتہ کچھ عرصہ سے درپیش ہے اس کی ماضی میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ آپ اگر کسی گاڑی پر سفر کر رہے ہوں تو جگہ جگہ ''جائے شہادت ۔۔۔۔'' کے سائن بورڈز آویزاں نظر آئیں گے۔ اگر آویزاں ان ناموں اور ان بورڈز کی تفصیلات معلوم کی جائیں تو ان میں سے چند وہ ہوں گے جو مختلف حادثات میں شہادت کے منصب عظیم پر فائز ہوئے ہوں گے جبکہ ایسے بہت سے نام نظر آئیں گے جن کی وجہ شہادت کا پس منظر کچھ اور ہوگا۔

ایک بیچارہ عاشق اپنی محبوبہ سے ملاقات کے لیے رات کو اس کے گھر گیا۔ وقت مقررہ پر جب ''جائے محبت'' پر پہنچا تو محبوبہ کے بھائیوں کو خبر ہو گئی۔ پھر ہونا کیا تھا ایک تنہا ناتواں جان ہٹے کٹے چھ مسٹنڈے بھائیوں کے ہاتھ لگ گئی۔ اس کے بعد جو اس ''مظلوم جان'' کے ساتھ ہوا راوی اس پر خاموش ہے۔ ہاں صبح اس کی لاش سڑک کے کنارے کٹی پھٹی حالت میں ملی۔ نہایت تزک و احتشام سے اس مظلوم کی آخری رسومات ادا کی گئیں، تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ اس کی حیات و خدمات اور زریں کارناموں پر ہر ایک نے اپنی

بساط کے مطابق روشنی ڈالی اور آخر کار اس ''خاک'' کو ''سپرد خاک'' کر دیا گیا۔ اس طرح ''پہنچی وہیں پے خاک جہاں کا خبیث تھا'' کے مصداق ایک معصوم جان رزق خاک ہوئی۔ اب اس جگہ جہاں سے وہ لاش ملی تھی بڑا سا سائن بورڈ ہر گزرنے والے کو ''جائے شہادت'' کے عنوان سے اپنی طرف متوجہ کرتا نظر آتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے بنک لوٹنے کا فیصلہ کیا اور وقت مقررہ پر بنک پر حملہ آور ہوئے۔ گن پوائنٹ پر تمام کیش لوٹ کر فرار ہونے کو تھے کہ بازار میں لوگوں کو اس ڈاکے کی خبر ہو گئی۔ چند جوان عجلت میں بنک کی چھت پر چڑھ گئے۔ اب جو ڈاکو بھائی بنک سے باہر نکلے تو چھت سے ایک نوجوان نے سیمنٹ کا بلاک اُٹھا کر سیدھا ڈاکو کو دے مارا اور یوں وہ ڈاکو موقع پر ڈھیر ہو گیا جبکہ باقی ڈاکو بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ عرصہ قبل مجھے اس ڈاکو کے علاقے میں جانے کا اتفاق ہوا اور جب اس قبرستان سے گزر ہوا جہاں وہ ''رزقِ خاک'' تھا تو قبر کے کتبے پر شہید ہونے والے اس ڈاکو کا مع القاب تذکرہ تھا۔ میری نظر کبھی تو قبر پر لگے کتبے پر جاتی تو کبھی خیال اس بنک کی طرف جاتا جہاں واردات کرتے ہوئے یہ ''شہید'' ہوا۔

شہدائے وطن کی یہ تعداد تو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے مگر گزشتہ چند دہائیوں سے تو وطن عزیز میں شہدا کی کھیپ تیار کرنے کے لیے باقاعدہ فیکٹریاں لگا لی گئی ہیں۔ ہر کوئی وطن کی اس ناموس پر قربان ہونے کے لیے تیار اور اپنے تئیں شہید ہو کر اپنے لیے محل پکا کرنے کے لیے سرتوڑ کوششوں میں مصروف ہے۔ وطن عزیز کا کوئی گلی کوچہ، مسجد، سکول اور ادارہ اس سے ماورا نہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جو ایک گروپ کے لیے شہید ہے وہ دوسرے گروپ کے لیے مردار اور جو دوسرے کا شہید ہے وہ پہلے کا مردار اور زندیق............

ہر آنے والی حکومت اپنے دور میں اس کے لیے باقاعدہ ''آپریشنز'' کا انعقاد کرتی ہے۔ جو حکومت اپنے دور میں اس کام کے لیے سب سے زیادہ بجٹ مختص کرتی اور سب سے زیادہ آپریشنز لانچ کرتی ہے وہ سب سے زیادہ محبِّ وطن قرار پاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان ساری کارروائیوں کے نتیجے میں اب وطن عزیز کا بچہ بچہ وطن کی محبت میں وطن کی ایک ایک اینٹ اُٹھا کر بھاگ رہا ہے اور ان اینٹوں سے اپنا گھر بنا کر وطن سے اپنی محبت کا اظہار کر رہا ہے۔ جو باقی بچ رہے ہیں وہ ''سٹڈی ویزا'' کے نام پر اپنے والدین کی عمر بھر کی جمع

پونجی لگا کر دیارِ غیر کی خاک چھان رہے ہیں۔

دنیا بھر میں مجموعی طور پر اتنے خودکش بمبار نہیں پائے جاتے ہوں گے جتنے اکیلے اس وطن عزیز میں پائے جاتے ہیں۔اس معاملہ میں بلاشبہ ہمارا ملک خودکفیل ہے اور کہے بغیر بھی ساری دنیا میں اپنی سپلائی بھیجنے کے لیے ہمہ تن تیار رہتا ہے۔اگر آپ کو اس بات میں ذرا سا بھی شک ہو تو گزشتہ چار دہائیوں کے شہدا کے اعداد و شمار اُٹھا کر دیکھ لیجیے۔کہاں کہاں نہ لٹا قافلہ فقیروں کا کہ مصداق کہاں کہاں یہ بمبار نہیں پہنچے ہوں گے اور کیا کیا گُل انہوں نے نہیں ''بجھائے'' ہوں گے اس پر آنے والے دور میں ہی کوئی فیصلہ ہو سکے گا۔سر دست اس حوالے سے ایک لطیفہ سنیں جو مارکیٹ میں گردش کر رہا ہے کہ: ایک خودکش کش بمبار نے جنت سے اپنے سرغنہ کو کال کر کے بتایا کہ بارود والی خودکش جیکٹ میں بارود تھوڑا کم ڈالا کریں پچھلی مرتبہ بھی ہمارا ایک ساتھی خودکش جیکٹ کے پھٹنے پر جنت سے کوئی پانچ سو کلومیٹر دور آگے جا کر گرا تھا۔

شہدا کی اس فہرست میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان ساری کارروائیوں میں شہادت کا رتبہ حاصل کرنے سے رہ جاتے ہیں وہ باقاعدہ انسانی سمگلروں کے ذریعے بیس تیس لاکھ روپے فی کس خرچ کر کے ''ڈنکی'' لگاتے ہیں اور یوں وطن کی سرحدوں سے دور کسی بحر ذخار میں آبی مخلوق کا رزق بن کر شہادت کے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں۔سمندروں کی خاموش لہریں کتنے ہی ایسے شہداء کی شہادت کی گواہ ہیں جو''سہانے مستقبل'' کی آس لگائے اور خواب سجائے کشتیوں کے ذریعے''ڈنکی'' لگا کر کبھی بحرالکاہل،کبھی بحراوقیانوس تو کبھی''سرخ و سیاہ سمندروں'' کی تہوں میں گمنام ہو گئے۔کتنے ہی ایسے گمنام ہوں گے جو کنٹینروں کے ذریعے ڈنکی لگانے کے چکر میں کنٹینروں میں حبس اور دم گھٹنے سے دم توڑ گئے ہوں گے اور کتنے ہی پیدل صحراؤں کو چھانتے صحراؤں کی خاک ہو گئے ہوں گے۔مگر یہاں اور وہاں کے حالات میں فرق یہ ہے کہ یہاں جگہ جگہ جائے شہادت کے سائن بورڈ نصب کرنے کی سہولت ہے اور وہاں کسی صحرا اور سمندر کے کنارے ایسے کوئی بورڈ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔

اب تو کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب کسی شہید کا کوئی دن نہ منایا جا رہا ہو،تقریبات کا انعقاد نہ کیا گیا ہو اور ان کی یاد میں عرس و میلے نہ منعقد کیے جا رہے ہوں۔جو اس سب کے باوجود بھی اس ''عظیم سعادت''

سے محروم رہ جاتے ہیں وہ شہدا کی روح کے ایصال کے لیے با قاعدہ فلاں شہید میموریل کرکٹ ٹورنامنٹ، ہاکی یا فٹ بال ٹورنامنٹ، میموریل مشاعرے، میموریل دنگل اور میموریل میلے اور تقریبات کا انعقاد کر کے اس تمام ریاضت کو کسی ''مہمان خصوصی'' کو ''ملت'' کر کے مرحوم کی روح کو ''ایصال ثواب'' کرتے ہیں۔ شہر شہر گھوم کر دیکھ لیں آپ کو شہدا اور غازیوں کی دھرتیاں ہی ملیں گی۔ ایک ایک ادارے کو وزٹ کر لیں ضرور وہ کسی نہ کسی شہید کے نام سے منسوب ہوگا۔ یہ سلسلہ یوں ہی جاری وساری رہا اور دنیا سے رخصت ہونے والا ہر ایک یوں ہی شہید کا اعزاز لے کر رخصت ہوگا تو آنے والے وقت میں اس خطے میں ایک انچ جگہ بھی ایسی نہیں ملے گی جہاں کسی شہید کی جائے شہادت کا کوئی سائن بورڈ نظر نہ آئے۔

اس میں بھی خاص بات یہ ہے کہ اگر تو اس شہید کی کسی خاص قبیلے اور شعبہ سے وابستگی رہی ہو اور اس شعبہ کے لیے اس کی خاص خدمات بھی رہی ہوں تو ان خدمات کے اعتراف کے طور پر اس ادارے یا اس کے کسی بلاک یا گلی محلّہ اور سڑک کو اس شہید کے نام منسوب کرنا کوئی بات بھی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں عموماً اس شہید سے منسوب وہ ادارہ اور شعبہ کر دیا جاتا ہے جس کے حروف تہجی سے بھی شاید شہید کی نسبت نہ رہی ہو۔ یہاں تو صورت حال یہ ہے کہ بس شہید کا تعلق کسی مخصوص قبیلے یا جماعت سے ہونا چاہیے یا وہ ''شہید'' حزب اقتدار سے وابستہ ہونا چاہیے تاکہ اس جماعت کے ذریعے آسانی سے اس کا منسوبگی نوٹیفکیشن کروایا جا سکے اور اس شاہراہ یا ادارے کو ان کے متعلقہ شہید سے منسوب کیا جا سکے۔ جو اس ''عظیم سعادت'' سے محروم رہ جاتے ہیں وہ پانچ سال انتظار کرتے ہیں تاکہ اگلی بار اقتدار میں آ کر اپنے شہدا کے نام سے باقی ماندہ ادارہ جات پر بورڈ آویزاں کر سکیں۔

ہماری ہر گلی ''شہید گلی''، ''شہید گلہ''، ہر چوک ''شہدا چوک''، ''چوک شہیداں'' اور ہر سڑک اور پل شاہراہ ''فلاں شہید و فلاں پل'' ہے، اگر اس بات میں ذرہ بھی شک ہے تو کسی بھی چوک چوراہے کا دورہ کر کے دیکھ لیجیے۔ وطن کی آبرو کے لیے جنھوں نے جان لٹائی ان کے نام پر منسوبگی سمجھ میں آتی ہے۔ مگر جس طرح کی دوڑ اب شہدا کے حوالے سے معاشرے میں عام ہوتی جارہی ہے اس صورت حال میں مسئلہ ان ''بیچاروں'' کا رہ جاتا ہے جن کے پاس کوئی شہید نہیں جس کے نام پر سیاست کی جا سکے یا جس کے نام سے کسی ادارے کو

وابستہ کر کے اپنا نام روشن کیا جا سکے۔ ہر کوئی نام وری کے چکر میں ہے ہر کنبہ ہر قبیلہ اور ہر گروپ کسی نہ کسی طور پر انگلی کٹوا کر شہیدوں میں نام لکھوانا چاہتا ہے۔ ہر فرد اپنے قبیلے کے نام کو زندہ رکھنا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ خود کچھ بھی کرنے کو تیار نہیں۔ اس کی ساری دوڑ اس بات کے لیے ہے کہ شہید کوئی اور ہو اور نام وری اس کی ہو۔ یہاں ہر کوئی اپنی ناموری کو تیار ہے سوائے اپنی جان راہِ حق میں لٹانے کے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ باقی کیا رہتا ہے ہمارا تو اتنا ہی ماننا ہے کہ یہ ساری کوششیں اپنی جگہ مگر بالآخر باقی رہے گا نام صرف اللہ کا............

☆☆☆

فنافی زوج

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جتنے بھی جاندار پیدا کیے ہیں وہ سب جوڑوں کی صورت میں ہیں جو کے نراور مادہ کہلاتے ہیں۔ ہرنوع کے جاندار کی اپنی ہی قسم کی جنس مخالف کی طرف رغبت ازلی اور فطری ہے اورنسلی بقا کی ضامن ہے۔ یہ سارے جاندار اپنی فطرت اور جبلت کے مطابق امورسرانجام دیتے ہیں کبھی ایسانہیں ہوا کہ کسی ایک نوع کے نر نے مادہ کی یا مادہ نے نر کی ذمہ داری سنبھالی ہو۔ بلکہ ہرایک اپنا تفویض کردہ کام ہی سرانجام دیتا ہے۔ زمین پر دیگر جانداروں کی طرح انسان بھی ایسا ہی جاندار ہے جسے حیوان ناطق بھی کہا جاتا ہے اور ارسطو کے بقول انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔ حیوان اس لیے کہ دیگر جانداروں کی طرح یہ بھی لگ بھگ وہی امورسرانجام دیتا ہے جو دوسرے سرانجام دیتے ہیں ہاں حیوان ناطق ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ نے اسے عقل وفہم سے بھی نوازا ہے جس کی بناپر اسے دوسرے جانداروں پر فوقیت حاصل ہے۔

انسان کی معاشرہ میں رہتے ہوئے اپنی نوع کی جنس مخالف کی طرف رغبت اور محبت فطری اور ازلی ہے اور یہ نسل انسانی کی بقا کی ضامن بھی ہے۔ دیگر جانداروں کے برعکس انسان معاشرہ میں قبیلوں اور خاندانوں کی صورت میں رہتے ہیں اورنسل انسانی کی بقا کے لیےان کے درمیان باقاعدہ ایک طریقہ کار کے تحت شادی بیاہ کے امورسرانجام دیے جاتے ہیں۔علم سیاسیات کی روح سے معاشرے میں بسنے والے مختلف خاندانوں کو مادرسری، پدرسری، ۔۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔کہا جاتا ہے۔ یہ تقسیم دراصل کسی ایک معاشرہ میں رہنے والے افراد معاشرہ میں مردوں اورعورتوں کے کردار کے حوالے سے کی گئی ہے۔لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے مختلف براعظموں میں بسنے والے اربوں انسانوں کے درمیان معاشرتی زندگی کسی نہ کسی خاص نظم کے تابع ہوتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں عموماً مرد کو بیرونی معاملات میں سربراہ کے طور پرگردانا جاتا ہے جبکہ عورت

کی ذمہ داری گھریلو زندگی سے متعلق ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب سے پوری دنیا میں مرد و زن کے درمیان مساوات کا نعرہ بلند ہونے لگا مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں نے بھی کارزندگی سرانجام دینے کے لیے ایک آیا سے لے کر ہوائی جہاز اُڑانے تک ہر ایک کام میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے اور ایسا کرنے میں بہت زیادہ قباحت بھی نہیں اگر وہ اپنے دائرے کے اندر رہ کر امور سرانجام دے تو جہاں جہاں تک جا سکتی ہے اسے جانا چاہیے۔ لیکن اس مسابقت کی دوڑ میں اب جو بات مشاہدے میں آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ اب دونوں نے اپنی اپنی ذمہ داری کو ترک کر کے دوسرے کی ذمہ داری لینے کی کوشش شروع کر دی ہے جو فطری حوالے سے بھی اور معاشرتی حوالے سے بھی باعث فکر ہے۔

عربی زبان میں زوج کا لفظ میاں اور بیوی دونوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس کی جمع ازدواج ہے اور صرف عورت کے لیے لفظ زوجہ اور امراۃ کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب سے معاشرہ میں مادیت کی دوڑ میں اضافہ شروع ہوا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان بھی یہ دوڑ تیز سے تیز تر دکھائی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ اب تو شادی بیاہ میں بھی حسب نسب اور کفو سے کہیں زیادہ اس بات پر نظر رکھی جاتی ہے کہ لڑکی اور لڑکا کام کیا کرتے ہیں۔

عموماً ازدواجی زندگی کے آغاز کے بعد زن مرید اور رن مرید جیسی اصطلاحات بھی سننے اور دیکھنے کو ملتی ہیں جو کہ کسی نہ کسی حد تک درست بھی ہوتی ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا جو شوہر زن مرید نہیں وہ گویا شوہر ہی نہیں بس ایک ڈکٹیٹر ہے جو طاقت وقوت کے بل بوتے پر فریق مخالف کی مرضی اور منشاء کے برخلاف اپنے حقوق تو حاصل کرتا ہے مگر بدلے میں اپنے فرائض پر توجہ نہیں دیتا۔

مگر ایک ایسا شخص جو شادی سے پہلے تو بالکل ٹھیک ٹھاک انسان ہو اور شادی کے اگلے دن سب کچھ چھوڑ کر تارک الدنیا ہو جائے اسے عرف عام میں فنا فی زوج یا فنا فی زوجہ کہا جاتا ہے۔ شاید ایسے ہی کسی فنا فی زوجہ کو دیکھ کر ابن انشاء نے کہا تھا کہ جب انسان نے اپنے ارتقائی سفر کا آغاز کیا تو اس کی بندروں کی طرح باقاعدہ دُم تھی۔ مادہ کی محبت میں اس انسان نے اتنی کثرت کے ساتھ محنت وریاضت کی کہ اس کی دُم کہیں جھڑ گئی اور وہ اس حال کو پہنچا جو اب ہے۔

بات ہورہی تھی فنافی زوجہ کی تو آپ حیران ہورہے ہوں گے کہ ہم نے فنافی اللہ کی اصطلاح تو سن رکھی ہے اور یہ بھی کہ فنافی اللہ سے مراد ایک ایسا شخص جو اپنا سب کچھ دنیاوی آسائش و آرام اور حیثیت و مرتبہ اپنے خالق حقیقی اور محبوب حقیقی کو پانے کے لیے قربان کردے اور اس راہ سلوک پر چل کر عشق حقیقی کو پانے کے لیے اپنا تن من دھن ایک کردے سالک کہلاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں شاعر نے کہا تھا کہ

فنافی اللہ کی تہہ میں بقا کا راز مضمر ہے
جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

تو ذرا سوچیے جو شخص اپنے مجازی محبوب کو پانے کے بعد اس کی خوشنودی کے لیے اپنی ہستی اپنا مرتبہ اپنا سب کچھ قربان کر کے فنافی زوجہ ہوجائے اس کی زندگی اور راحت وسکون کے متعلق کیا کیا کہا اور لکھا جاسکتا ہے۔

ساری دنیا میں اس وقت خواتین کے حقوق اور تمام تر شعبہ ہائے زندگی میں ان کی برابری کی بات ہورہی ہے۔ ان کے لیے تقریباً تمام ممالک قانون سازی کر رہے ہیں اور ہر ایک شعبۂ زندگی میں ان کی شمولیت کو یقینی بنایا جارہا ہے۔ دنیا بھر میں ان کی اوسط شرح کی برابری کے لیے اقدامات کیے جارہے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ سامنے آیا ہے کہ اب تقریباً تمام ہی ممالک میں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ ان حالات میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون جب حرکت میں آئے گا تو فنافی زوجہ کے علاوہ مردوں کے پاس اپنی نسل کی بقا اور ارتقاء کا کوئی راستہ نہیں بچے گا۔

ہمارے ایک جاننے والے ہیں شادی سے پہلے بڑے بانکے اور سجیلے قسم کے نوجوان تھے۔ جب کبھی شادی کا تذکرہ چل نکلتا تو سب سے زوردار تقریر ان کی ہوتی کہ ایک دفعہ میری شادی ہوجائے دیکھ لینا کیا کیا کروں گا اور کس طرح اپنی بیوی کو دبا کر رکھوں گا۔ مگر جب شادی ہوئی تو کچھ اس طرح سے فنافی نفس مطمعنہ ہوئے کہ اس کے بعد کسی نے ان کو کہیں بھی نہیں دیکھا۔ اور رہی ان کی بیگم تو اس نے تو آتے ہی اسے باور کرادیا تھا کہ تمام بڑے بڑے کاموں مثلاً پاک امریکہ، پاک بھارت تعلقات، ملکی لا اینڈ آرڈر کے مسائل، ملکی سیاسی صورت حال، آئندہ کے ملکی وزیر اعظم اور ملکی داخلہ مسائل کے حوالے سے گھر میں تمہارا حکم چلا کرے گا اور گھر کی صفائی، برتن، کپڑے دھلائی، کون سا مہمان گھر آئے گا کون نہیں، کیا خریداری کرنا ہے، کس شادی

یا تقریب میں جانا جیسے گھریلو چھوٹے چھوٹے مسائل کے حوالے سے میری رائے پر فوقیت دی جائے گی۔

اس دن سے آج تک جو جو کام گھر میں ہوتے ہیں وہ بیوی کی مرضی سے شوہر سرانجام دیتا ہے اور حالات حاضرہ سے متعلق تمام مسائل پر حکم شوہر کا چلتا ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ گھریلو چھوٹے چھوٹے کاموں میں کہیں اولاد جنم دینے کا کام اس کے ذمے نہیں لگایا گیا ورنہ تو............

اس سے یاد آیا...... یورپ میں جہاں جدید سائنسی تحقیقات ہو رہی ہیں وہیں مرد و زن کے درمیان مساوات کے حوالے سے بھی زور و شور سے کام جاری ہے۔ اس مساوات میں دیگر معاملات میں مساوات کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ کوئی ایسا سائنسی طریقہ کار دریافت کیا جائے جس کے ذریعے مرد کو بھی وہ سعادت سونپی جائے جو صرف عورت کا خاصا ہے اور جس کی بنا پر ماں کے قدموں تلے جنت رکھی گئی ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی پہلے ہی بہت زیادہ ہے اگر خدانخواستہ سائنسی تحقیقات میں ایسی کوئی صورت نکل آئی جس کے تحت باپ بھی ماں بن سکا تو پھر جنت اس کے قدموں میں بھی ہو گی۔

☆☆☆

ذاتیں بھی تو پہلی سی ذاتیں نہیں رہی

ذات اور برداری کے بارے میں اپنا خیال یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی ذاتوں اور برادریوں کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک اچھے لوگوں کی برادری اور دوسری برے لوگوں کی برادری۔ گویا کہ دنیا کے تمام اچھے لوگ ایک برادری اور تمام برے لوگ ایک برادری شمار ہوتے ہیں۔ ذات اور برادری کی یہی تقسیم بندوں کا نیک ذات ہونا اور بد ذات ہونا کہلاتی ہے۔ مگر کیا کریں اس معاشرے کا کہ اس نے تو بندوں کی ذات و برادری کی تعریف ہی بدل کر رکھ دی ہے اور بندوں کو اس طرح سے ذاتوں برادریوں میں تقسیم کر دیا ہے کہ جہاں وہ اپنی پہچان سے بھی گئے۔ حالانکہ نسل آدم کا سلسلہ آدم اور حوا سے شروع ہوا اس نسبت سے تمام ہی لوگ بنی آدم کہلاتے ہیں۔

طوفان نوح نے جب دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا اور تمام نسل آدم طوفان نوح کا شکار ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ گئی تو نئی تخلیق ہونے والی نسل انسانی آدم ثانی کی اولاد کہلائی یوں یہ سلسلہ پھر بھی کسی ایک شخص یا زیادہ سے زیادہ تین اشخاص حام، سام اور یافث کے گرد گھومتا ہے۔ اس نسبت سے بھی ذات برادری میں زیادہ تفاوت نہیں پائی جاتی۔ مگر جوں جوں انسانی آبادی بڑھی اور خطوں اور ممالک کی شکل میں تقسیم در تقسیم کے عمل کا شکار ہوئی۔ نئی نئی بولیاں اور زبانیں معرض وجود میں آنے لگیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کی شکل میں ایک حکمران اور ایک خدمت گار طبقہ کہلایا تو ذاتوں اور برادریوں کی نئی جہت بنتی چلی گئی۔ اس طرح ایک حکمران طبقہ اور ایک رعایا کا طبقہ کہلایا۔

دنیا میں پائی جانے والے معدوم اور موجود نسلیں اسی ارتقائی سفر میں ایک دوسرے کے وجود کا انکار کرتی اور فنا و بقا کے فلسفے کی بھینٹ چڑھتی کچھ قانون اعداد کثیر کے اصول کے تحت آج بھی دنیا میں اپنا وجود قائم کیے ہوئے ہیں جبکہ کچھ اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکیں اور صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ یہ سلسلہ جانے کب سے جاری ہے اور کب تک جاری و ساری رہے گا۔

برصغیر کے منظرنامے پر نگاہ دوڑائیں تو یہاں صورت حال دنیا سے کہیں مختلف ہے۔ دنیا کے سب سے قدیم زمینی مذہب ہندومت کے زیراثر یہاں پروان چڑھنے والی آبادی شروع سے ہی چار ذاتوں برہمن، کھشتری، ویش اور شودر میں کچھ اس طرح تقسیم ہوئی کہ ہزاروں سال کا ارتقائی سفر بھی ان کی تفریق کو ختم یا بدل نہ سکا اور آج بھی پورے طمطراق کے ساتھ یہ ذاتیں اسی طرح قائم ودائم ہیں۔ ماضی میں بدھ مت نے اور قریب کے زمانے میں اسلام نے ہندوؤں کے ذات پات کے نظام کو کافی حد تک متاثر کیا مگر اس کے باوجود ان کا یہ نظام کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔

انگریزوں نے جب برصغیر پر قبضہ جمایا تو انھوں نے چونکہ حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی چنانچہ ان کو اخلاقی طور پر زوال پذیر کرنے کے لیے ہر طرح کے وہ اقدامات کیے جن سے ان کی شناخت مٹائی جا سکے۔ ان کے اعلیٰ طبقات کو پست ترین بنا کر پیش کیا، ان کے ہیروؤں کو زیرو کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے آزمائے گئے۔ مختلف پیشوں سے وابستہ اچھے اچھے خاندان کمی کمین کر دیے گئے۔ مسلمانوں کی عظمت کی علامات اور لباس ویٹروں اور بھانڈوں کے لباس کر دیے گئے۔ مسلمانوں کے ہیروؤں کے نام پر اپنے کتوں کے نام رکھے گئے۔ وڈیروں اور نوابوں سے کام لینے کے لیے ان کو مالا مال کر کے باقی طبقات کو ان کا باج گزار بنا دیا گیا۔ دفاتر کے باہر اور ذاتی خدمت کے لیے ایسے دربان مقرر کیے گئے جو گھنٹی کی ٹن کی آواز پر دم ہلاتے جی حضوری کے لیے فوراً حاضر ہو جاتے۔

یہ سلسلہ قیام پاکستان کے اتنے سال گزرنے کے باوجود آج بھی جاری ہے۔ آپ کسی بھی ادارے میں چلے جائیں چپڑاسیوں، دربانوں اور جی حضوری کرنے والے اصل ملازمین سے کئی گنا زیادہ تعداد ان کے بنائے اور تقسیم کیے ہوئے درجہ چہارم کی صورت میں آپ کو ہر دفتر اور ادارے میں ملے گی۔ انگریز کو یہاں سے گئے زمانے گزر گئے مگر ہمارا فرسودہ نظام آج بھی وہی ہے۔ یورپ میں آپ کسی بھی ادارے میں چلے جائیں آپ کو وہاں اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اپنے نازنخرے بھی خود ہی اُٹھانا پڑیں گے اس کے برعکس ہمارے ہاں صاحب کے کتوں کو نہلانے کے لیے بھی الگ سے ملازمین رکھے جاتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وطن عزیز میں ذات برادری کی تقسیم میں جو ارتقاء دیکھنے کو ملا ہے وہ

اعلیٰ وادنیٰ طبقے کی صورت میں سامنے آ رہا ہے اور یہ ذاتیں کلاس کی شکل میں اوپر والی یعنی Uper class اور نچلی یعنی Lower class کی صورت میں دیکھنے کو مل رہی ہیں ۔ ملک کا حکمران طبقہ، بیوروکریسی، اسٹیبلشمنٹ ،نواب، جاگیردار، وڈیرے یہ سب اپر کلاس کی نمائندگی کرتے ہیں جب کہ عام رعایا کا شمار نچلے طبقے میں ہوتا ہے۔ان دونوں کے بین بین ایک تیسرا طبقہ بھی کہیں نہ کہیں اپنی موجودگی ظاہر کرتا دکھائی دیتا ہے جو مڈل کلاس کہلاتا ہے مگر اس میں ابھی اتنا دم خم نہیں کہ وہ خود کو اپر کلاس میں شمار کر سکے۔

اپر کلاس اور لوئر کلاس کا اندازہ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ ایک ہی قبیلے کا اپر کلاس کا فرد قرابت داری اور تعلق قائم کرتے ہوئے اپنی لوئر کلاس کے قبیلے سے زیادہ اپنی کلاس کو ترجیح دیتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ایک مثال سادات کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے جہاں وہ شتہ داری کرتے ہوئے سادات کو ہی ترجیح دیتے ہیں اور قبیلے سے باہر رشتہ داری کو معیوب خیال کرتے ہیں۔مگر جب کلاس کی بات آتی ہے تو مجال ہے کہ اپر کلاس کا کوئی سید اپنی بیٹی کا رشتہ کسی لوئر کلاس کے سید کے ساتھ طے کرے۔اس کے برعکس وہ اپنی ہی کلاس میں رشتہ تعلق قائم کرے گا۔گویا ہمارے ہاں اس وقت جو ذات برادری کا تصور پھل پھول رہا ہے وہ کنبے قبیلے یا اچھے اور برے لوگوں کی برادری کے برعکس اپر کلاس اور لوئر کلاس کی شکل میں پروان چڑھ رہا ہے جو کے معاشرے کے لیے کسی بھی صورت میں نیک شگون نہیں ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب تمام وسائل سمٹ کر ایک ہی طبقے کی ملکیت بن جائیں گے اور دوسرا بڑا طبقہ ان وسائل سے محروم ہو کر روح و بدن کے رشتے کو بھی قائم نہیں رکھ پائے گا تو وسائل کی یہ غیر مساویانہ تقسیم کسی بڑے تصادم کی شکل میں سب کچھ مٹا کر رکھ سکتی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے کے اچھے لوگ اس حوالے سے آگے آئیں وہ معاشرے میں ذات برادری کی تقسیم کا معیار اچھے اور برے کی بنیاد پر کریں نہ کہ وسائل کی بنیاد پر۔وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کے خاتمہ کے لیے اپنی آواز بلند کریں۔مثالی معاشرے کی تشکیل اور جدوجہد کے لیے ذات پات، کنبے قبیلے اور گروہ ومسلک کے دائرے سے باہر آئیں اور عملاً مثالی معاشرہ تشکیل کریں۔

☆☆☆

لوگ کیا کہیں گے

''لوگ کیا کہیں گے'' یہ محض ایک جملہ ہی نہیں ہماری زندگی کی وہ آفاقی سچائی ہے جس سے ہم چاہ کر بھی انکار نہیں کر سکتے۔ بھلا ایسا کیسے ہے اور کیوں ہے اور ایسی بھی کیا بات ہے کہ ہم چاہ کر بھی اس سے انکار اور فرار حاصل نہیں کر سکتے۔تو اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ ہم ٹھہرے رسوم و روایات کے قیدی۔سو ایک رسوم و روایات کے قیدی کی اپنی کیا زندگی ہوتی ہے وہ تو تابع ہوتا ہے ان قوانین کے جو اس کے پرکھوں نے جانے کیا سوچ کر بنائے تھے اور کیوں بنائے تھے۔

ہماری زندگیاں تمام ہو جاتی ہیں، ہمارا دل چاہ رہا ہوتا ہے کہ ہم یہ زندگی یوں گزاریں، اس پل کو اس طرح گزار کر اپنے لیے خوشگوار بنائیں مگر یہ صرف سوچا جا سکتا ہے اس پر عمل کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا کہ لوگ کو کیا کہیں گے۔

ارے بھئی لوگوں نے تو کہنا ہی ہے تم اپنی مرضی سے جیو یا لوگوں کی مرضی سے اُنھوں نے بات کرنا ہے۔اس لیے کہ ان کے پاس کرنے کے لیے کوئی اور کام جو نہیں۔لہذا سارا دن بیٹھ کر یہ دیکھنا کہ دوسرا کیا کر رہا ہے، کیسے کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے اور پھر اس پر قیمتی رائے کا اظہار کر دینا۔ یہ رسم جانے کب سے ہے اور کب تک جاری رہے گی۔

آپ نے وہ کسان اور اس کے بیٹے اور گدھے والی کہانی تو سن رکھی ہو گی جو اپنے گدھے کے ساتھ شہر جا رہے تھے۔ایک بستی سے ان کا گزر ہوا تو لوگوں نے ان کو دیکھ کر کہا کہ یہ باپ بیٹا کتنے بیوقوف ہیں کہ پیدل چل رہے ہیں اور گدھے پر سوار نہیں ہوتے۔ یہ سن کر باپ نے بیٹے کو گدھے پر سوار کرا دیا اور خود گدھے کے ساتھ پیدل چلنے لگا۔اگلی بستی سے گزر ہوا تو لوگ ان کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے کہ کتنا نافرمان بیٹا ہے خود تو گدھے پر ہے اور باپ پیدل چل رہا ہے۔ یہ سن کر وہ فوراً گدھے سے اترا اور باپ کو گدھے پر سوار کرا دیا۔ اگلی بستی سے گزر ہوا تو لوگ ایک بار پھر باتیں کر رہے تھے کہ کتنا ظالم باپ ہے کہ بیٹے کو پیدل چلا رہے ہے اور خود

گدھے پرسوار ہے۔ یہ سن کر اس نے بیٹے کو بھی گدھے پر اپنے ساتھ سوار کرالیا۔

اب جو راستے میں لوگوں کے درمیان سے ان کا گزر ہوا تو لوگ آپس میں باتیں کررہے تھے کہ کتنے ظالم باپ بیٹا ہیں جو بیچارے گدھے پر اتنا ظلم ڈھا رہے ہیں۔ یہ بات سنی تو دونوں باپ بیٹا گدھے سے اترے۔ آپس میں مشورہ کیا اور اس کے بعد گدھے کی اگلی پچھلی ٹانگیں باندھی۔ ایک ڈنڈا اس کی ٹانگوں کے درمیان سے گزارا اور آگے پیچھے سے ہو کر گدھے کو اپنے کاندھے پر اُٹھالیا۔ اب جو اگلی بستی سے ان کا گزر ہوا تو اس حالت میں ان کو دیکھ کر لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے اور کہنے لگے کہ کتنے بیوقوف ہیں جو گدھے کو یوں اُٹھائے ہوئے جارہے ہیں۔ بستی سے باہر پہنچے تو ندی کے ایک تنگ سے پل پر سے گزرتے ہوئے جوں ہی گدھے کی نظر پانی میں پڑی تو خوفزدہ ہو کر اس نے ٹانگیں چلانی شروع کیں اور یوں وہ دھڑام سے پانی میں جا گرا، یوں باپ بیٹے کی گدھے سے بھی جان چھوٹی اور اس مصیبت سے بھی جس کا وہ جانے کتنی دیر سے شکار تھے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ تو بات کریں گے، اب یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ ان کی باتوں پر کان دھرنا ہے یا اپنا کام کرتے رہنا ہے۔ آپ خود کو تو خوش اور مطمئن کر سکتے ہیں مگر آپ سب کو خوش نہیں کر سکتے۔ ہم بطور معاشرہ اپنا سب کچھ لوگوں کے لیے ہی تو کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنا گھر اس لیے بناتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ کوئی مر جائے تو اپنے اس حقیقی رشتے کی موت سے زیادہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ آنے والے لوگ کیا کہیں گے۔ شادی بیاہ کے موقع پر اپنی بساط سے بڑھ کر اخراجات صرف اس لیے کرتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ غرض اپنا کھانا، پینا، پہننا ایسا کون سا کام ہے جو ہم اپنے لیے کرتے ہیں۔

ہم سارا کچھ ہی تو لوگوں کے لیے کر رہے ہوتے ہیں، لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے، لوگوں کو خوش کرنے کے لیے۔ مگر لوگ ہیں کہ خوش ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ان کی ڈیمانڈز ہیں کہ روز ہی بڑھتی جا رہی ہیں اور ہم ہیں کہ ہمارے پاس ان کو پورا کیے بغیر چارہ نہیں۔ زندگی کے اس مصنوعی پن نے ہم سے زندگی کی حقیقی خوشیاں ہی چھین لی ہیں۔

ہم اپنی آدھی عمر اس سوچ میں گزار دیتے ہیں کہ لوگ ہمارے بارے میں کیا کہیں گے اور آدھی عمر

کے بعد خود کو یہ یقین دلانے میں کہ لوگوں کو تو ہماری کوئی پرواہ ہی نہیں تھی ۔ ہم نے فضول میں لوگوں کا بھوت خود پر طاری کر کے اپنی خوشیوں کو غارت کیا مگر ''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئی کھیت'' کے مصداق وقت گزر چکا ہوتا ہے اور ہمارے پاس سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں ہوتا۔

مردوں کے مقابلے میں صنف نازک کو یہ زیادہ مسئلہ رہتا ہے کہ فلاں شادی یا تقریب میں جانا ہے ۔ اگر کوئی اچھا برینڈڈ ڈریس پہن کر نہ گئے تو لوگ کیا کہیں گے یا اگر خدانخواستہ ان کا پہنا ہوا کسی اور نے بھی پہنا ہوا ہوا تو پھر لوگ کیا کہیں گے۔اس چکر میں وہ گھر کے مردوں کو کچھ ایسا گھن چکر پر چڑھاتی ہیں کہ بیچارے مرد کولہو کے بیل کی مانند پستے چلے جاتے ہیں۔

یہ زندگی بہت سادہ بھی ہو سکتی تھی ،اس کے رنگوں سے زیادہ دلفریبی سے لطف اندوز ہوا جا سکتا تھا۔ اس کی راحتوں سے لطف اندوز ہونے کے کتنے ہی مواقع ہم نے محض یہ سوچ کر گنوا دیے کہ لوگ کیا کہیں گے اور بالآخر لوگ ہماری لحد پر آ کر ہماری اس عمر بھر کی ریاضت کا صلہ اس جملے کے ساتھ دے کر چلے جاتے ہیں کہ مرحوم بہت اچھے انسان تھے۔

☆☆☆

قربانی

اللہ کی راہ میں اتنی قربانیاں انسانوں نے نہیں دی جتنی تنہا جانور دے چکے ہیں ۔انسانوں کی قربانیاں تو ان کی گردن پر چھری پھرتے ہی ادا ہو جاتی ہیں مگر جانوروں کی اس وقت تک معلق رہتی ہیں جب تک قربانی کے گوشت کا آخری حصہ فریج سے نکل کر پیٹ تک نہیں پہنچ جاتا۔انسانوں اور جانوروں کی قربانی میں اتنا سا فرق ہے کہ جانوروں کی قربانی کے لیے ان کا قبلہ رو ہو کر ذبح ہونا ضروری ہے جبکہ انسان ''جہاں ہے جیسے ہے'' کی بنیاد پر قربان ہو جاتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے کسی ایک صدی میں سب سے زیادہ انسانوں کی قربانی فتنۂ تاتار کے دوران دی گئی ۔کہا جاتا کہ تیرھویں صدی کے اس انسانی المیے میں گیارہ کروڑ انسان اس قربانی کی بھینٹ چڑھے جو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے مجموعی قتل عام سے بھی دگنا ہے ۔گیارہ کروڑ انسانوں کی اس قربانی نے ملکوں کا سیاسی جغرافیہ بدل کر رکھ دیا جس کے آثار آج بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک جانوروں کی قربانی کا تعلق ہے تو جانوروں کا جتنا ذبح عام ثواب کے طور پر مسلمان عید کے موقع پر کرتے ہیں اتنا کسی اور تہوار کے موقع پر کوئی قوم نہیں کرتی۔

قربانی کے معاملے میں آبی مخلوق اس حوالے سے بری الذمہ ہے کیوں کہ جب قربانی کے احکام آئے تو اس میں آبی مخلوق کو شامل نہیں کیا گیا ورنہ آج جس طرح اونٹ ، گائے ، بکری اور دنبہ وغیرہ قربان ہوتے ہیں ایسے ہی مچھلیاں بھی قربان ہوتی تو جانے آبی مخلوق کا کیا حال ہوتا۔اگر ایسا ہوتا تو موجودہ مہنگائی کے دور میں لوگ قربانی کے جانور خریدنے کی بجائے بڑے بڑے جال لے کر دریاؤں اور سمندروں میں پہنچ جاتے اور اپنی پسند کی مچھلی شکار کر کے قربان کرتے ۔اگر ایسا ہوتا تو منافع خوروں کی یہ ٹولیاں جو عید قرباں کے ایام میں بڑی بڑی منڈیاں سجا کر لاکھوں روپے کی بولیاں لگاتی ہیں ان کے ڈیرے دریاؤں اور سمندروں

کے کنارے ہوتے اور مچھلیاں شکار کر کے منہ مانگے دام میں فروخت کرتے۔مگر مچھلی کے شکار کے راستے میں ایک مسئلہ پھر بھی حائل رہتا اور وہ یہ کہ قربانی میں خون بہا ضروری ہے اور مچھلی کی قربانی کی صورت میں خون بہا کی صورت پوری نہ ہوتی۔ یقیناً اللہ کی حکمت بھی اس میں یہی ہو گی۔

باقی رہے یہ ناجائز منافع خورتو ان کا تو جہنم میں بھی الگ ہی طبقہ ہوگا کیونکہ اگر یہ باقی جہنمیوں کے ساتھ مشترکہ طور پر ہوں گے تو وہاں بھی اپنی منافع خوری کی کوئی نہ کوئی دلیل ڈھونڈ لائیں گے۔ دنیا بھر میں تہواروں کی روایت یہ ہے کہ اس موقع پر ملک بھر میں اشیا کے نرخوں میں کمی کر کے صارفین کو سہولت دی جاتی ہے اس کے برعکس ہمارے ہاں سال بھر یہ منافع خور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب کوئی اسلامی تہوار آئے اور ہم منہ مانگے دام عوام الناس سے وصول کر کے ان کی چمڑی اتار سکیں۔

روایت ہے کہ جو قربانی انسان دنیا میں کرتا ہے قیامت کے دن وہ اس جانور پر سوار ہوگا۔تو پھر جو لوگ مریل جانوروں کی قربانی کرتے ہیں ممکن ہے وہاں وہ جانور ان کی پشت پر سوار ہوں۔ اللہ کے پاس تمھارے جانوروں کا خون پہنچتا ہے نہ گوشت بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے۔اب تقویٰ جیسی جنس بازار میں اتنی کمیاب ہو چکی ہے کہ ڈھونڈے سے بھی میسر نہیں۔ایسے میں اللہ تک اپنی نیتوں کو پہنچانا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

گزشتہ کچھ عرصہ سے ملک میں مہنگائی کے اعداد و شمار نے جس طرح اُڑان بھر کر فلک کو ہاتھ لگایا ہے قوت خرید اس حد تک کم ہوگئی ہے کہ ایک شخص چاہ کر بھی قربانی سے قاصر ہے۔ وطن عزیز کا ایک بڑا طبقہ غریب اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو سال بھر اس دن کا انتظار کرتا ہے کہ گوشت کھا سکے۔ اس طبقے کے لیے حکومت وقت اور صاحب ثروت حضرات کے پاس بھی کوئی حل نہیں۔اس لیے اس طبقہ کو اپنے جذبات اور احساسات کی قربانی پر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

انوکھے لاڈلے

غیر مسلموں کے لیے چونکہ دنیا کی زندگی ہی دنیوی اور اُخروی زندگی ہے اس لیے وہ اسے دنیاوی زندگی قرار دیتے ہوئے سلیقے سے گزارتے ہیں اور اُخروی شمار کرتے ہوئے جی بھر کر دنیاوی نعمتوں کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا معاملہ ہے تو چونکہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہوتی ہے اس لیے ہم اسے قید خانہ قرار دیتے ہوئے جتنا ممکن ہو سکے آفاقی اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔تبھی تو کرپشن کے جتنے بھی اعشاریے مقرر کیے گئے ہیں ان کے اعتبار سے مسلمان بطور قوم اور مسلمان ممالک دونوں کرپشن میں اولین نمبروں پر شمار ہوتے ہیں اور کرپٹ ترین کہلاتے ہیں جبکہ تمام کافر ممالک کا شمار کرپشن سے پاک ممالک میں ہوتا ہے۔ ہمارا تو یہ بھی ماننا ہے کہ کافر سارے جہنم میں جائیں گے اور مسلمان تمام تر نالائقیوں اور نافرمانیوں کے باوجود جنت کی ابدی نعمتوں کا دائمی لطف اُٹھائیں گے۔اس کام کے لیے صرف ایک بار کلمہ پڑھ لینا کافی ہے۔

ہمارے بڑوں نے اس حقیقت کا ادراک بہت پہلے کر لیا تھا تبھی آنے والی نسلوں کے لیے کلمہ کے نام پر ایک ایسی مملکت قائم کر کے دے گئے جہاں آپ جتنی مرضی بدعنوانیوں میں زندگی گزار دیں کلمہ کی برکت سے فردوس کے بالا خانے ابدی ٹھکانہ ہوں گے۔اس بات کو مزید حتمی اور یقینی بنانے کے لیے ہم اپنے تمام تر کاروباروں اور اداروں کو مکی ، مدنی ، بسم اللہ اور محمدی جیسے بڑے بڑے سائن بورڈ لگا کر اندر جتنی بھی ملاوٹ ، جعل سازی ، ناپ تول میں کمی کر سکتے ہیں کرتے ہیں کیونکہ وہاں سرخرو ہونے کے لیے یہ نسبتیں کافی ہوں گی۔

رشوت ، سفارش ، کرپشن ، دھوکہ دہی اور لوٹ مار سے مال بنا کر بڑے بڑے بنگلے بنا کر ان پر وَاللّٰہُ خَیۡرُ الرَّازِقِیۡنَ لکھ کر عمر بھر کی سیاہی کو سفیدی میں بدل دیتے ہیں۔عدالتوں کے باہر اِعۡدِلُوۡا ھُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی کا بڑا سا بورڈ لگا کر عدالتوں کے اندر انصاف کا جو حال ہم کرتے ہیں اس پر مہر تصدیق ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل اور

دیگر
اداروں کی رپورٹیں کرتی ہیں جن کے تحت دنیا بھر میں انصاف کے انڈکس میں ہم 140 میں سے 138 نمبر پر ہیں۔ رشوت اور سود چونکہ اللہ کو سخت ناپسند ہے اس لیے ہم نے اس کا بائیکاٹ کر کے عطیہ اور نذرانہ لینے پر اکتفا کر لیا ہے جبکہ بنکوں کے سود کو ہم نے سروس چارجز میں شمار کر کے اس کو بھی جائز قرار دے لیا ہے۔ ذرا تصور کریں کیسا عجیب منظر ہو گا جب کرپٹ ترین ممالک اور مسلمان کلمہ کی برکت سے جنت کے بالا خانوں پر مسند نشین ہوں گے اور دنیا بھر میں عدل، صداقت، ایفائے عہد، نظم وضبط کی پابندی اور تمام اخلاقی اچھائیوں والے غیر مسلم صرف کلمہ نہ پڑھنے کی پاداش میں جہنم کا ایندھن بن رہے ہوں گے۔

جنمے جانے کی تکلیف کے علاوہ مسلمانوں کو دوسری تکلیف صرف ختنے کی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اس کے بعد دنیا اور آخرت کے سارے مزے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ہماری گائنا کالوجسٹس کے سزیرین کی پریکٹس کی بدولت اس تکلیف سے بھی ہم بری ہو گئے ہیں۔ اب جی بھر کر اللہ کی زمین پر اللہ کی نافرمانیاں کرتے اور فطرت کے اصولوں سے انحراف میں زندگی گزار دو آخرت تو آپ کی ہی ہے۔ رہے کافر تو وہ اگر چہ ختنے اور جنمے جانے کی تکلیف سے مبرا ہیں مگر ساری زندگی اصولوں کی پاسداری اور نظم وضبط کی پابندی میں گزارتے ہیں جو بذات خود ایک مشکل ترین کام ہے یہ گویا وہ جان جوکھوں والا کام ہے جو انہی کافروں کو زیبا ہے، ہم مسلمان تو ان مشکلات میں پڑنے سے باز آئے۔

ہمارے پاس فخر کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہمارا ایک شاندار ماضی تھا۔ ہم گزشتہ ایک ہزار سال سے اپنے مدارس اور تعلیمی اداروں میں نئی نسل کو یہی باور کرا رہے ہیں کہ مسلمانوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے تھے اور وہ اس کے بانی تھے۔ رہی موجودہ عہد میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کی پیش رفت کی بات تو اس معاملے میں ہمیں انت کا بیر ہے اور ہماری سائنس اور ٹیکنالوجی سے بالکل بھی نہیں بنتی۔ ہمیں اپنے بچوں کو بتانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ مسلمانوں کے قرون اولیٰ میں طب اور سائنس میں شاندار کارنامے تھے۔ اسی لیے گزشتہ پانچ سو سالوں میں ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں کوئی نہیں جانتا۔ ہم اپنا سیٹلائٹ مشن بھی چائنہ کے تعاون سے اُنہی کی سرزمین سے خلا

میں روانہ کرتے ہیں تا کہ ہماری پاک سرزمین راکٹ کی مہلک تابکاریوں سے محفوظ رہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ اس پاک سرزمین کو کھیلوں جیسی آلائشوں سے پاک کرنے کے لیے بھی ہم نے ہائبرڈ ماڈل تیار کر لیے ہیں اور تمام کھیلوں کی سرگرمیاں اپنے وطن سے دور کسی ''نیوٹرل وینیو'' پر کرانے کو ترجیح دیتے ہیں۔اب تو حال یہ ہے کہ ہم نے ورچول ورکنگ کو عملی کام پر ترجیح دے کر قصہ ہی تمام کر دیا ہے۔اب تو گوادر پورٹ کا افتتاح کرنے کے لیے بھی ہمیں گوادر جانے کی ضرورت نہیں آپ اسلام آباد میں بیٹھ کر ورچول افتتاح کر لیں۔کرونا کا بھلا ہو جس نے ہمیں جاتے جاتے آن لائن سٹڈی اور ورک فرام ہوم جیسی اصطلاحات دے کر بہت سارے کاموں میں آسانی پیدا کر دی ہے۔بڑی بڑی جامعات ہزاروں روپے فیس لے کر آن لائن پڑھائی کی سہولیات دے دیتی ہیں تا کہ آپ کو گھر کی دہلیز پر گھر جیسے ماحول میں پڑھائی ملے اور جامعات کا اساتذہ کے بغیر ہی آن لائن ریکارڈڈ لیکچرز سے کام چل جائے۔

ہم اپنے تمام عہدے اور کام حلف لے کر کرتے ہیں اور حلف کا اختتام اللہ میرا حامی و ناصر ہو سے کرتے ہیں۔پھر اس کے بعد اللہ کو حامی و ناصر بنا کر ایوان عدل سے ایوان سیاست تک اور وہاں سے تمام شعبہ ہائے زندگی تک جتنا بھی ہمارا بس چلتا ہے مال بناتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد حج وعمرہ کر کے اسے پاک کر لیتے ہیں۔ہم وہ انوکھے لاڈلے ہیں جنھوں نے دنیا میں جینے کے اپنے ہی اصول وضع کر رکھے ہیں جو دنیا کی کسی اور قوم پر صادق نہیں آتے۔

☆☆☆

مصنف کی دیگر کتب

1. بساطِ جاں (شاعری)
2. تعارفِ قرآن وحدیث (تحقیق)
3. نیوگنی سے کشمیر تک (تاریخ)
4. ورق ریزے (انشائیے)
5. اُجالوں کا سراغ (خاکے)

قرآن وحدیث
دلشاد اریب
نیوگنی سے کشمیر تک
دلشاد اریب
بساطِ جاں
دلشاد اریب
مکتبہ یوسفیہ
+92-300-8124958 +92-323-4792670